



سہ گھنٹہ کا شہر

احمد یوسف

۲۳ گھنٹے کا شہر

احمد یوسف

فرد

۵۵ سایہ سالگت ہے۔

شاید اس کے وجود کے قدم ابھی ابھی آگے کو بڑھ جائیں گے اور وہ بھی کسی اور طرف نکل جائے گا۔

لیکن پھر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا وجود کہیں غائب ہو گیا ہے اور وہ مضطرب ہے کیسے سایہ ہوں تو پھر میرا وجود کہاں ہے؟ اور اگر میں خود وجود ہوں تو پھر میرا سایہ ہے؟ ایک الجھن — کئی کئی گروہ پڑی دور کی درد سہی۔

میں اس کے ترددات کو کسی قدر بھانپ لیتا ہوں اور آگے بڑھ کر اس سے دریافت کرتا ہوں کہ — لیکن خود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے اس سے کیا دریافت کیا۔

اُس کا اتہ پتہ؟ —

اُس کا مزاج؟ —

اُس کے روز و شب؟ —

کیا ہوا تھا؟ — مختصر سا جواب یہ ہے کہ کچھ ہوا تھا، اور اگر کچھ نہ ہوا ہوتا تو پھر ہم یہاں کیونکر ہوتے؟ —

ہمارے آگے کی ہر شے سیاہی کے نقاب میں لپیٹی ہے۔ دیوار کی تصویریں، چھت کی نقاشی، دروازوں کے رنگ دروغن — ویسے ہماری نظروں میں کتنے ہی گزرے ہوئے جہاں آباد ہیں۔ مجھے اب ہاتھ روم جانا ہے۔ بہت سنبھل سنبھل کر باہر آتا ہوں، اور وہاں میں پھر اسی طرح بچتا بچاتا اپنے بستر تک پہنچتا ہوں۔ غور سے دیکھتا ہوں تو بستر سے ایک تکیہ غائب تھا۔ میری بیوی میری عادتوں سے بخوبی واقف ہے، اس لئے اس نے دری میں دو تکیے لپیٹ دئے تھے۔ ایک تکیہ میرے سر کے نیچے رہتا ہے اور دوسرا پہلو میں — پہلو میں تکیہ نہ لگاؤ تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ دل کسی پہاڑی سے لڑھکتا چلا جا رہا ہے۔ یہ تکیہ گویا اس گرتے ہوئے دل کو تھام لیتا ہے۔ پانی میں ٹکے سے پی چکا ہوں۔ چھت پر ایک بڑے سے ٹکے میں پانی رکھا ہے، پاس میں المونیم کا ٹنگ ہے اور اس کے برابر ایک چھوٹی سی تپائی پر کچھ پلاسٹک کے گلاس رکھے ہیں۔ اب میرے پاس صرف ایک تکیہ رہ گیا ہے، یوں میں اپنے ایک بازو سے تکیے کا کام لیتا ہوں۔ اس پرانی حویلی میں دوسری طرف عورتوں اور بچوں کے سونے کا انتظام کیا گیا ہے میری بیوی اور بچے وہیں ہیں۔

نیند نہیں آرہی ہے۔ دماغ بے طرح بھرا ہے، دل پر بڑا بوجھ ہے۔

یہ جو اس فرش پر یہاں سے وہاں تک لوگ اپنے اپنے جزیروں میں آباد ہیں، ان میں میری ہی طرح کچھ اور لوگ بھی ہوں گے جنہیں نیند نہیں آرہی ہوگی، ویسے کہا جاتا ہے کہ نیند تو دار پر بھی آجاتی ہے، اس لئے کچھ لوگ سو بھی چکے ہوں گے۔

جب آبادی میں بیٹھے نکل آتے ہیں تو لوگ جنگلوں کی طرف بھاگتے ہیں۔

نیند نہیں آرہی ہے کیا کیا جائے؟ — سر پر چلتے ہوئے پنکھے کو دیکھا جائے —

بیکار — دیواروں پر شنگی تصویروں کو دیکھا جائے — عبت — چھت کے نقش و نگار کو دیکھا جائے — فضول —

آخر کیا کیا جائے؟ —

وہ ٹٹماتے بلب جو کچھ فاصلے پر جل رہے ہیں، وہ تو محض اس لئے ہیں کہ ہم ہال سے باہر نکلنے وقت اور ہال میں داخل ہوتے وقت کسی سے ٹکرا نہ جائیں، کسی کو کچل نہ دیں۔ یوں اس مدہم مدہم سے اُجالے میں پڑھنے پڑھانے کا سوال بھی نہیں اُٹھتا۔

میرے اردو پڑوس میں جو لوگ اپنے اپنے بستر پر لیٹے ہیں، اُن کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ سو رہے ہیں یا جاگ رہے ہیں۔ پھر ہمارے دل بھی تو بہت بھرے ہوئے ہیں۔ — جب دل بہت بھرے ہوں تو کوئی بات نہیں کی جاتی، اسی طرح جیسے دل بالکل خالی ہوں تو سوچنا پڑتا ہے کہ آخر کیا بات کی جائے۔

گھڑ پال دیر تک نہادی دیتا رہا۔

ایک شخص باغیچہ روم سے نکل رہا ہے، شاید مجھے بھی باغیچہ روم جانے کی حاجت ہے۔ لیٹے ہوئے لوگوں سے بچتا بچتا میں ہال سے باہر نکل کر باغیچہ روم کی طرف جاتا ہوں، وہاں سے واپس آکر منگے کا پانی پیتا ہوں، اور پھر کھلی چھت پر کچھ دیر کھڑے کھڑے آسمان کا رنگ دیکھتا ہوں۔ — وہاں بڑی رودنی ہوتی۔

ہال میں پہنچ کر اسی طرح سہمے سہمے قدم رکھتا ہوا اپنے بستر پر پہنچتا ہوں۔ ابکہ یہ خبر ملتی ہے کہ بستر کی چادر اور دوسرا تکیہ بھی غائب ہے۔

یہاں کتنے ہی لوگ ایسے ہوں گے جو تنگے کے بغیر لیٹے، اسی انتظار میں ہوں گے کہ کوئی تنگے والا اُٹھے تو اس کا تکیہ غائب کیا جائے۔ اس نیم تاریک سے کمرے میں کسی چیز کا تلاش کرنا بھی تو ممکن نہیں، پھر اس ہال کا ایک سرا ایسا بھی ہے جہاں یہ مدہم مدہم سی روشنی بھی نہیں پہنچتی، اور اگر غائب شدہ چیزوں کی تلاش کی جائے تو عین ممکن ہے کہ میری یہ دری بھی غائب ہو جائے۔

اب میرا ایک بازو میرے سر کے نیچے ہے اور دوسرا پہلو میں۔ — پوٹے بھاری ہو چکے ہیں اور جامیاں آنے لگی ہیں۔ یہاں میری ہی طرح کچھ اور لوگ بھی ہوں گے جو ان کیفیتوں سے دوچار ہوں گے، مگر سو نہیں رہے ہوں گے کیونکہ نیند کا لطف تو اسی وقت ہے جب دل کو مکمل سکون

ہوا اور یہ یقین ہو کہ ہم محفوظ ہیں۔

یہاں تو ہمہ وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی 'جاگتے رہو'۔ جاگتے رہو' کی صدائیں بلند کر رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہم جاگ ہی رہے ہیں تو پھر یہ صدائیں کیوں بلند کی جا رہی ہیں۔ یہ لوگ جو اس ہال میں کچا ہیں مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ ان میں سے بیشتر کو میں پہچانتا بھی نہیں۔ ہمارا اور ان کا صرف ایک درکار رشتہ ہے۔ درد ہمارے اہل ان کے درمیان ایک قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ کچھ ہوا تھا، کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

یہاں اس ہال میں جو لوگ لیٹے ہیں، وہ یا تو سو رہے ہیں، یا سونے کا سوانگ بھر رہے ہیں۔ مکمل خاموشی ہے، کوئی خزانے بھی نہیں لیتا۔ اگر کسی طرف سے کوئی آہ بھی بلند ہوتی ہے، تو اس طرح جیسے سیاہ چادر اور دھڑک نہ لگی ہو۔ یہاں بے پردہ آہیں نکالنا خطرے سے خالی نہیں کہ راہ میں چور، لیٹرے اور رہزن بھی بستے ہیں۔

دماغ بھرا ہے۔ پتھروں پر بڑا بوجھ ہے اور ان سے وقفے وقفے پر آنسو کے قطرے بھی نکل جاتے ہیں۔

میرا ایک بازو سر کے نیچے ہے، اور دوسرا میرے پہلو میں ہے، میں جاگ رہا ہوں، شاید اس لئے بھی کہ مجھے یہ خدشہ لاحق ہے کہ اگر میری آنکھ لگ گئی تو اس ہال میں جہاں اب تک میری ایک چادر اور دو کئے غائب ہو چکے ہیں، کہیں کوئی میرا بازو بھی نہ کاٹ لے کہ آخر وہ بھی تو نکمے کا کام لے رہا ہے۔

اُترتی چڑھتی روئقیں

۵۵ جوزینے سے اُتر رہا ہے اور وہ جوزینے پر چڑھ رہا ہے — دونوں کی کسی نہ کسی مقام پر بڑھتی ہوئی جاتی ہے، اور تب یہ ہوتا ہے کہ علیک سلیک کے بعد ایک اوپر چلا جاتا ہے اور دوسرا نیچے۔

نام جلال الدین احمد خاں تھا لیکن ہمارے یہاں وہ کہلاتا جَلَو تھا۔ گھر کے دوسرے نوکروں کی طرح وہ بھی ایک نوکر تھا، پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ دادامیاں کے خاص نوکروں میں سے ہے، یوں کہ دادامیاں کا کوئی کام اس کے بغیر نہیں چلتا تھا۔

دوسرے بھی ان کے کام کر سکتے تھے، لیکن ان کا یہ قاعدہ تھا کہ کوئی سامنے آجائے تو کہتے ”بھئی جَلَو کو بلاؤ وہ سب کچھ جانتا ہے۔“

اُن کی اس بات کا کوئی بُرا بھی نہیں مانتا تھا، کیونکہ سبوں کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ جَلَو وہ سب کچھ جانتا ہے جو دوسرے نہیں جانتے ہیں۔

اُن کی چیزوں کو رکھنے کا طریقہ۔ ان کی پسند ناپسند۔ ان کے معمولات۔ یہ ساری باتیں ایسی تھیں، جن پر جلو کی پوری پوری گرفت تھی۔

اتنی بات تو میں بھی جانتا تھا کہ ان کے کلاک میں سو سوار کو ٹھیک اُس وقت چابی دی جاتی ہے، جب ریڈیو ۸ بجے صبح کی خبریں نشر کرتا ہے۔

لیکن پھر یہ کہ صبح وہ کس وقت منہ دھوتے ہیں۔ ان کے لئے گرم پانی کا انتظام کس ماہ سے کس ماہ تک کیا جاتا ہے۔ اُن کے ناشتے کی الماری میں کس موسم میں کونسا علوہ رہتا ہے۔ وہ صبح کے وقت کئے پیالی چائے پیتے ہیں۔ چائے میں شکر کتنی دی جاتی ہے۔ کچہری جاتے وقت وہ کونسی چھڑی استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے جوتوں میں پالش کتنے کتنے دلوں بعد کی جاتی ہے۔ وہ حجامت کتنے دلوں بعد نہواتے ہیں۔ وہ اپنے دانت کس وقت سے کس وقت تک لگاتے ہیں، اور ان کی صفائی کس کس وقت کی جاتی ہے، اور یہ کہ جس پیالے میں دانتوں کا سیٹ رہتا ہے اس میں پانی کتنی مقدار میں رکھا جاتا ہے۔ سویرے مجھ دانی اُتار کر کہاں رکھی جاتی ہے۔ انہیں دن میں کتنے پیکٹ سگریٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ دیاسلائی وہ کونسی استعمال کرتے ہیں۔ یہ وہ علوم تھے جن کی جستہ جستہ واقفیت تو گھر کے ہر فرد کو تھی، لیکن ان پر اتھارٹی جلال احمد عرف جلو ہی کو تھی۔

پانچ سال کی میری عمر تھی کہ مدرسے میں میرا داخلہ کر دیا گیا۔ جلو اس وقت لگ بھگ پچیس سال کا ہو گا۔ اس کا بڑا لڑکا بلال احمد خاں عرف بلو میری ہی عمر کا تھا۔ وہ بھی کسی مکتب میں پڑھتا تھا۔ بلو اکثر ہمارے یہاں آ جاتا، میرے گھر کے ان بچوں کی اتاری قمیض، پانچاے یا نیکر میں لمبوس جو اس کے ہم عمر تھے۔ پاؤں میں کھڑاؤں، ناک بہتی ہوئی، بال گرد سے اُٹے ہوئے، اور ہاتھ پاؤں میں گلیوں کا میل۔ لیکن ان دنوں بجز اس ذوق کے کہ ہم صاف ستھرے رہتے اور وہ گندہ رہتا، ہمیں اس کے اور اپنے مابین کوئی اور فرق نظر نہیں آتا تھا۔

بلو ہمارے درمیان گلیوں کے کھیل، گلی ڈنڈا، کا پنچ کی گولیاں اور لٹولے آتا۔ اور ہم اس کے

ساتھ گھر میں چھپ چھپ کر یہ سارے کھیل کھیلتے۔ دراصل ہمارے گھر میں کھیل کے اوقات مقرر تھے، اور بچوں کو شام کے وقت پارک میں یا کھیل کے میدان میں لے جایا کرتے تھے، لیکن گلیوں کے ان کھیلوں میں ہمیں بڑی دلچسپی کا احساس ہوتا، اور بتوں ان کھیلوں میں بڑا ہوشیار تھا۔ پر جب ہم کھڑے جاتے، گھر کی چھت پر یا کہیں کوئے کا تر میں تو ہماری پٹائی ہو جاتی، اور ہم سے کہیں زیادہ تو پٹیا، کیونکہ گھر والوں کا خیال تھا کہ بتو ہی ہمیں ان کھیلوں کا شوق دلانا ہے۔

پھر بتو کی پٹائی کے بعد جلال کی بھی اچھی خاصی خبر لی جاتی — ”بیٹے سے کہہ دو کہ گھر میں آنا ہے تو شریفوں کے اظہار کیجئے اور گلی کوچے کے آوارہ چھوڑوں کے کھیل بچوں کو نہ سکھایا کرے۔“ اس تنبیہ کے بعد بچا وہ بتو ایک بار اور اپنے باپ کے ہاتھوں پٹتا، اور خوب گالیاں سنتا۔ اس نوع کے حادثوں کے بعد بتو کچھ دنوں تک ہمارے یہاں آنا جانا چھوڑ دیتا۔ لیکن اپنی عمر کے بچوں کے ساتھ بڑی سی چھت اور بڑے سے گھر میں بھاگ دوڑ اور کھیل کا چمک اُسے کشاں کشاں ہمارے یہاں کیسے لاتا۔

دادامیاں کی تحویل سے اکثر کچھ نہ کچھ رقم غائب ہو جایا کرتی، لیکن وہ جس تہذیب کے آدمی تھے، وہاں طرح دینا اور چشم پوشی کرنا مزاج کا خاصہ بن چکا تھا۔ ہم سب جانتے تھے کہ ان چوریوں کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ ایاجان، میرے دونوں چچا اور گھر کے دوسرے افراد، اکثر دبی زبان میں دادامیاں سے کہا کرتے — ”جگو کو آپ نے بہت سر چڑھا رکھا ہے، یہ سب اُسی کی حرکت ہے۔“ لیکن دادامیاں ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی کو دے کر بھول گئے ہوں، یا حساب میں غلطی ہو گئی ہو — اور پھر جب تک کسی کو چوری کرتے دیکھا نہ جائے اس پر لازم کھنا بھی تو مناسب نہیں۔

مگر اس کو کیا کہیں گے کہ جب جگو ہمیں اسکول پہنچانے جاتا تو اس کی بیڑی کی ڈبیہ میں دو ایک سگریٹ بھی نظر آ جاتے، اور جب وہ ایک خاص شان سے سگریٹ نکال کر بیٹا تو اس کے دھوئیں کی بو ویسی ہی ہوا کرتی جیسی دادامیاں کے سگریٹ کی بو ہوا کرتی۔

تب کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ایک رات دادا میاں اپنے بیٹے میں سو سو کے دو نوٹ رکھ کر سو گئے۔ اُن کا بیٹہ ہمیشہ اُن کے سر پرانے گدے کے نیچے رہا کرتا تھا۔

دوسرے دن کچہری جانے کے وقت جب دادا میاں نے اپنا بیٹہ کھولا تو اس میں وہ نوٹ نہیں ملے، انہوں نے ادھر ادھر دیکھا، کبیش بکس اچھی طرح کھول کر دیکھا، لیکن وہ نوٹ کہیں نہیں ملے۔ پھر گھر والوں کو خبر ہوئی، اور سب لوگ اپنے اپنے طور پر نوٹوں کی تلاش میں لگ گئے۔ تب ہی میرے چھوٹے چچا نے کہا۔ ”ارے نوٹ یہاں کہاں ملیں گے، وہ تو جلّو کے گھر پہنچ چکے ہوں گے۔“ ان کے لہجے میں ترشی اور شکایت تھی۔

دادا میاں اُس وقت بھی اپنی وضع پر قائم رہے۔ ”نہیں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے۔“ لیکن یہ معاملہ نیگیں تھا کہ ان دنوں شور و پیے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ اتنے میں شفیق خاں مختار بھی آگئے۔ انہوں نے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کی، ادھر ادھر نوٹ تلاش کئے اور آخر میں انہوں نے بھی وہی کہا جو سب کہہ رہے تھے۔ ”میں تو سرکار سے برابر کہتا تھا کہ یہ جلّو بھروسے کا آدمی نہیں ہے۔“

تب ہی کسی نے پوچھا۔ ”جلّو ہے کہاں؟“ اس کے بعد اس کی کھوج شروع ہوئی۔ وہ پاس ہی ایک چائے خانے میں مل گیا۔ آیا تو دادا میاں نے اسے نوٹوں کے غائب ہونے کی خبر دی۔ جلّو قسم کھائے۔ لگا کہ وہ نوٹ اس نے نہیں نکالے ہیں۔

دادا میاں نے کہا۔ ”تم سے یہ کب کہا جا رہا ہے کہ تم نے نوٹ نکالے ہیں، میں تو تم سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم نے نوٹ دیکھے ہیں۔“

لیکن جلّو تھا کہ قسم کھائے جا رہا تھا۔ اس کی اس حرکت پر شفیق خاں مختار کو جلال آگیا، اور انہوں نے کہا۔ ”یہ بیخ ذات ایسے نہیں سے گا۔“ یہ کہہ کر وہ اُٹھے اور انہوں نے جلّو کو دو چار چائے کس کس کر لگائے۔

پھر ادھر ادھر سے بھی کچھ لات جوتے پڑے، لیکن جلّو تھا کہ ”اللہ کی قسم، اللہ کی قسم کی رٹ لگائے جا رہا تھا۔“

اُس دن ہم سبھوں کے سامنے پہلی بار دادامیاں نے گویا ایک راز کا انکشاف کیا۔
 ”جلو میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرے بٹے سے ریزگاریاں کس طرح کم ہو جاتی ہیں، سگریٹ
 کے پیکیٹ سے ہمیشہ دو چار سگریٹ کون غائب کرتا ہے، اور حلوے کی قباب سے حلوہ کون نکالتا ہے۔“
 یکا یک ان کا پارہ چڑھ گیا۔ ”کبخت تو نے میرے احسانوں کا یہ بدلہ چکایا، دور
 ہو جا میری نظروں سے۔“

جلال جانتا تھا کہ دادامیاں کا کہا سچر کی لیکر ہوتا تھا۔ ایک بار جو فیصلہ صادر کر دیتے تھے،
 اُس پر کسی بھی حال میں نظر ثانی کرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔
 وہ کچھ دیر کھڑا شفیق خاں کو گھورتا رہا، تب ہی شفیق خاں نے جوتا نکال کر کہا۔ ”حرام زادے
 مارتے جو توں کے فرش کردوں گا، بھاگ جایاں سے ورنہ پولس میں دے دوں گا۔“
 اس طرح جلال میٹر ٹھپوں سے اتر کر چل دیا، اور وہ روپے جان مال کا صدقہ سمجھ کر
 بھلا دے گئے۔

دس سال گزر گئے۔ دادامیاں نے خُلد کا آسٹیاں آباد کیا، اور ادھر ہماری دنیا میں وقت
 چنگیز بن کر اٹھا، اور اس نے یہاں سے وہاں تک قتل و غارتگری کا کاروبار شروع کر دیا۔ اس
 چنگیزی طوفان کے نتیجے میں ایک قباب دو ہو گئے، اور جا بجا دیواریں کھڑی ہو گئیں۔
 جب طوفان ذرا سرد ہوا تو ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنے ساتھ بہت سی رونقیں بھی لے گیا۔
 تصویریں ماند پڑ گئیں، درو دیوار کی قلعی اڑ گئی، اور ہم صورتوں کو دیکھ کر کچھ ایسا گمان ہونے لگا کہ
 وہ کریم نکالے ہوئے دودھ جیسے ہو گئے ہیں۔

ہر سونہا ک اُڑتی ہوئی، ڈھن ڈھناتی ہوئی جوئیاں اور مکینوں کے سُتے ہوئے چہرے
 جیسے ساری رات کوئی بھیانک خواب دیکھ کر اُٹھے ہوں۔

وہ شاخ جس پر آسٹیاں تھیں، طوفان کی نذر ہو چکی تھی، اور اب پاؤں تلے پتی ہوئی زمین
 تھی اور سر پر غیض و غضب ہیں ڈوبا ہوا سورج۔

نوجوان ایملائنٹ ایکسیج میں اپنے نام درج کر رہے تھے، اور ادھیڑ اور بولڈھے اپنی اپنی حویلیوں کو تک رہے تھے کہ انہیں کس طرح آمدنی کا ذریعہ بنایا جائے۔

جلال کے حالات اکثر اس کے سر سے معلوم ہوتے رہتے۔ ہمارے یہاں سے نکل کر وہ سیدھا کلکتہ کو بھاگ کھڑا ہوا۔ پاس میں روپے تو تھے ہی۔ کچھ بیوی بال بچوں کو دیا، اور کچھ اپنے ساتھ لیتا گیا۔ وہاں ایک موٹر ورکشاپ میں بلیر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ پھر معلوم ہوا کہ میکنک ہو گیا۔

اس نے اپنے سالے کے ذریعے اپنے بیٹے جلال کو بھی کلکتہ بلایا ہے، اور اسے وہیں پڑھا رہا ہے۔ وہ اپنے مالک کے بہت قریب ہو گیا ہے۔ وہ میڈ میکنک ہو گیا ہے۔

اور ایک دن اس کے سر نے بتایا۔ ”آپ نے کچھ سنا، جلال کا مالک مر گیا۔ چار پانچ مہینے ہو گئے۔ لا ولد تھا۔ بچا رہ۔“

کچھ دن اور بیتے تو ایک دن سر راہ جلال کے سر سے ملاقات ہو گئی۔ اُس نے چھوٹے ہی کہا۔ ”آپ کو کچھ خبر ہے۔ جلال نے اپنے مالک کی بیوہ سے نکاح کر لیا۔ اور تب ہی اُس نے اپنی برہمنی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”پیدائشی حرامی ہے، جس تھالی میں کھانا ہے، اسی میں چھید کرتا ہے۔ آپ کے دادا نے کیا کیا نہیں کیا تھا اس کے ساتھ لیکن.....“

تب ایک دن سفید قمیض، لٹھے کے کھڑکھڑاتے پاجامے اور پیٹنٹ کے چرم تلے جوتے میں جلال ہمارے یہاں وارد ہوا۔

وہ دیوان پر بیٹھا رہا۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ صوفے پر آ جاؤ، لیکن اس نے بتایا کہ وہ آرام سے بیٹھا ہے۔ اُس نے اپنی جیب سے سگریٹ نکالا، اسے جلایا اور پھر انگلیوں میں پھنسا کر خوب بے لمبے کش لینے لگا۔ اچانک جانے کہاں سے دادامیاں کے سگریٹوں کی بو میرے شانہ میں آئی، لیکن فوراً ہی جلال کے سگریٹ کی بو نے اُس بو کو پرے ڈھکیں دیا۔

میں اس کے لئے چائے اور ناشتہ لے آیا۔ وہ کچھ دیر تک حالات کا جائزہ لیتا رہا اور پھر بہت کچھ جان لینے کے بعد اُس نے پوچھا۔ ”بھیا کیا حال ہے؟“
میں نے کہا۔ ”بس اللہ کا شکر ہے۔“

اتنے میں ابا جان آگئے اور اس نے بڑی پھرتی سے سگریٹ پیسٹک کر اپنے جوتے سے مسل دیا اور انہیں سلام کر کے مودبانہ کھڑا ہو گیا۔

ابا جان نے کہا۔ ”بیٹھو بھئی جلال۔“

اس پر جلال نے کہا۔ ”بڑے صاحب آپ کا نمک کھایا ہے۔“

چنانچہ جب تک ابا جان صوفے پر نہ بیٹھے وہ دیوان پر نہیں بیٹھا۔

میں ہائی اسکول کر کے کالج میں داخل ہو چکا تھا، اور مجھ سے بڑے اونچی تعلیم پانے کے بعد نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھے۔

جلال نے بتایا کہ اس کا ورکشاپ خوب چل رہا ہے۔ اُس نے ایک پریس بھی خرید لیا ہے۔ ایک مکان تو اسے اپنی بیوی کا مل گیا ہے۔ اُس کے علاوہ اس نے ایک اور پلاٹ خرید لیا ہے، اور جلد ہی اس میں ہاتھ لگوانے والا ہے۔

جانے لگا تو اس نے ہاتھ جوڑ کر ابا جان سے کہا۔ ”کوئی ضرورت ہو تو اس خادم کو ضرور یاد کیجئے گا۔“

ابا جان زیر لب مسکرائے اور ہم نے محسوس کیا کہ جس طرح جلال کے جملے کی کسی تہیں تھیں، اسی طرح ابا جان کی مسکراہٹ میں بھی کئی تہیں چھپی تھیں۔ اب دادا میاں کی انکساری اور رواداری ابا جان میں بھی آگئی تھی، شاید حالات کا یہی تقاضہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”ضرور۔ ضرور۔“

اس کے بعد جب میں یونیورسٹی کے آخری تعلیمی سال میں تھا تو جلال ایک بار پھر آیا۔ اس دن اسے دیکھ کر میں یہ محسوس ہوا کہ جب وہ پھیلی بار آیا تھا تو گھر کی کچھ بچی کچھی رونق بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا، جو اب اس کے گرم کوٹ اور اس کے صاف ستھرے اور اچھی طرح پریس کئے ہوئے

پر یہ کہ ہر لمحہ وہ اپنی متوحش نگاہیں آگے کی جانب دوڑاتا، انہیں اپنے قدموں پہ ڈال دیتا۔ اپنی پشت کی طرف لے جاتا۔ کبھی وہ آگے بڑھتا چاہتا اور نہیں بڑھتا۔ کبھی وہ ٹپکے جانا چاہتا اور نہیں جاتا۔ کچھ عجیب طرح کی گم گشتگی تھی کہ وہ تھا بھی اور وہ نہیں بھی تھا۔ میں نے اسے اپنی گرفت میں لیا، اور تب کئی صدیوں تک گویا میں نے وجود سے سائے کا سفر اور سائے سے وجود کا سفر کیا۔

اور اس کے بعد کبھی دل نے کہا۔ تم نے جو سوچا تھا، سچ ہی سوچا تھا۔ یہ وجود ہے مگر وجود نہیں ہے، یہ سایہ ہے مگر سایہ نہیں ہے۔

میں نے اسے مخاطب کیا۔ 'اچھا بیٹھے نہیں تو پھر یہی بتاؤ.....' تب ہی میں نے اس کے پیٹ پر اپنا کان رکھ دیا۔ پیٹ پیٹھ تک پہنچ گیا تھا، اور شہر خموشاں کا شور تھا کہ آسمان سر پر اٹھارہا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ 'یہ شور کب سے اٹھ رہا ہے؟' ابتدا سے اسی طرح؟۔ یا یہ حالیہ زمانے کی بات ہے؟

لیکن وہاں تو سائے کو وجود کی تلاش تھی، اور وجود کو سائے کی۔ میرے اصرار پر کہ یہ شور کب سے اٹھ رہا ہے، اس نے ہاتھ سے 'پتہ نہیں' کا اشارہ کیا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ہاتھ کی کبھی کبھی انگلیاں، ایک دوسرے جاتے ہوئے سفرِ وجود کا مکان سے بھی پرے چلا جاتا ہے، کا پتہ دیتی تھیں۔

عجیب سی بات تھی کہ وہ جو 'ہاں' سے 'آں' کی راہ بھی مشکل سے طے کر سکتا تھا، اس کے آگے ایک ایسا سفر تھا جس کا آخری کنارہ وہم و گمان کی سرحدوں سے بھی آگے نکل چکا تھا۔

میں نے اس کے لمبوس کو غور سے دیکھا۔ اس کی اپنی رنگت کب کی اڑ چکی تھی۔ شاید برسوں کا میل اس کا سب کچھ چاٹ گیا تھا۔ تار تار۔ کلوروفل پھڑپھڑے ہوئے بتوں کی طرح۔ چھپی چھپی جالیاں نمایاں ہونے کی کوششوں میں مصروف۔ یہ کپڑے کئی ایک جگہ سے پھٹے ہوئے بھی تھے، اور ان میں پسینے اور میل نے مل کر ایک دائمی سی بو کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔

کپڑوں اور اس کی شکل و شباهت سے پھوٹی پڑتی تھیں۔

اس بار وہ تھوڑے اصرار پر ہمارے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

اباجان وغیرہ تو آج بھی اُسے 'تم' ہی سے مخاطب کر رہے تھے، لیکن ہم لوگ اسے 'آپ' کہہ رہے تھے، کیونکہ اب ہم ماضی کے قصے تیزی سے بہہ کرتے جا رہے تھے۔ اب ان ابواب کو کھولنے کا ہمیں بہت ہی کم موقع ملتا تھا۔

جلال نے بتایا کہ بلال نے بی۔ اے کر لیا ہے اور اب وہ اسے کسی کام میں لگانا چاہتا ہے۔

وہ گھنٹے دو گھنٹے بیٹھ کر جانے لگا تو اس نے اباجان سے کہا۔ "بڑے صاحب اگر بھیا کا یہاں کوئی سلسلہ نہ ہو سکے تو آپ انہیں کلکتہ بھیج دیجئے۔"

اباجان نے آج بھی اسے وہی مختصر سا جواب دیا جو آج سے کئی سال پہلے دے چکے تھے۔ "ضرور۔ ضرور۔"

لیکن جب وہ چلا گیا تو انہوں نے بڑا سا منھ بنا کر کہا۔

"چھوٹے آدمیوں کے یہی طور طریقے ہوتے ہیں۔ تمہیں بھی اپنے کارخانے میں مرسری بنانا چاہتا ہے۔"

تب ایک دن راہ میں جلال کے کسر سے ملاقات ہوئی تو اس نے جلال کے متعلق بتاتے ہوئے کہا۔ "اس عورت سے اسے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ بلال کی ماں کو ماہ بہ ماہ اتنی رقم بھیج دیتا ہے کہ اس کی مرضی میں گذر بسر ہو جاتی ہے۔ بلال کو بھی کسی بزنس میں لگانا چاہتا ہے۔"

پھر کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ کلکتہ کے مضافات میں بلال اور اس کے چھوٹے بھائی نے موٹر پارکس کی دوکان کھول لی ہے۔

کتنے سال اور بیت گئے، میں اپنے دفتری روز و شب میں الجھا ہوا تھا۔ اباجان اب مستقل گھری پر رہنے لگے تھے کہ اچانک ایک دن جلال پہنچ گیا۔ اتفاق سے وہ اتوار کا

دن تھا اور ہم بھی لوگ پرموجود تھے۔

اب وہ مزے میں ہمارے ساتھ صوفے پر بیٹھتا اور یوں لگتا کہ وہ ہمارے حالات کا صحیح ادراک حاصل کرنے کے بعد اب ہمارے سامنے کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ البتہ آج بھی جب ابا جان اس کے سامنے آجاتے اور وہ سگریٹ پیتا ہوتا، تو چپکے سے سگریٹ کو ایش ٹرے میں ڈال کر مسل دیتا۔

اُس نے بتایا کہ بڑے لڑکے کے لئے اُس نے یہاں موٹر پارٹس مارکیٹ میں ایک دوکان لی ہے۔ کل اس کا افتتاح ہے۔ اس خوشی میں آج شام اُس اپنے گھر پر محفل میلاد کا اہتمام کیا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”دوکان کی گہری کتنی دی؟“

اُس نے آہستہ سے شہادت کی انگلی اٹھادی۔

میں نے کہا۔ ”ایک لاکھ؟“

اُس نے آنکھوں کے اشارے سے ’ہاں‘ کہا۔

وہ جانے لگا تو اس نے ابا جان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”بڑے صاحب چھوٹا منہ اور

بڑی بات۔ پر آپ ہمارے گھر تشریف لائیں تو ہماری عزت بڑھے گی۔“ انہوں نے پھر اسی انداز میں کہا۔ ”ضرور۔ ضرور۔“

لیکن شام ہوئی تو ابا جان نے کہا۔ ”بیسہ آج کی سب سے بڑی قدر ہے۔ تم لوگ چلے جاؤ“ میں کہاں جاؤں گا۔“

جلال کا سسرالی مکان کافی بڑا سا دکھائی دیا۔ معلوم ہوا کہ اس پاس کے کئی ایک چھوٹے

مکانات خرید کر اس نے اس مکان کی توسیع کرائی ہے۔

مکان سرکری ٹیوب اور نیچے بلیموں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔

جلال مجھے کنارے لے گیا۔ ”یہ سب سرکار مرحوم کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔“ اس نے بلال

سے ملایا۔ ہماری اُترن پہننے والا اور پاؤں میں کھڑاؤں کٹا کھٹانے والا، میلا کچھلا بلال آج خوبصورت

سافری سوٹ زیب تن کے تھا۔

تب ایک دن میں بس اسٹینڈ پر کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک نئی جیپ وہاں پر آگئی۔
 جیپ سے بلال نے سر نکال کر کہا۔ ”دفتر جا رہے ہیں تو آجائے، میں بھی اُدھر ہی جا رہا ہوں۔“
 میں نے کہا۔ ”نہیں آپ جائیے میں چلا جاؤں گا۔“
 لیکن اس کے بے حد اصرار پر بالآخر مجھے جیپ میں بیٹھنا ہی پڑا۔
 وہ اپنے کسی کاروباری دوست سے باتیں کر رہا تھا اور میں اس کے پورٹ فولیو میں گم تھا جس پر
 ’سید بلال احمد‘ کا لیبل چسپاں تھا۔
 اچانک اس نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”گیتا جی ان سے ملے، یہ ہیں میرے دوست
 یوسف صاحب۔ ان سے ہمارے خاندانی مراسم ہیں۔ ان کے والد بھی میرے والد کے دوست ہیں۔“
 میں نے فی الفور ماضی کے سارے اوراق کو جلا کر خاک کر دیا، اور گیتا جی سے ہاتھ ملاتے ہوئے
 کہا۔ ”جی ہاں ان کے والد میرے والد کے گہرے دوستوں میں ہیں۔“

۲۳ گھنٹے کا شہر

وہاں کوئی مکان باہر سے مقفل نہیں ہوا کرتا، سبھی اندر سے مقفل ہوا کرتے۔ گھروں کے اندر دروازوں کی کنڈیاں چڑھی رہا کرتیں، اور ان کی چٹخیاں لگی رہا کرتیں، بلکہ بیشتر گھروں میں تو دستور تھا کہ لوگ دروازے اور کھڑکیاں اچھی طرح بند کرنے کے بعد اینٹ اور پتھر رکھ کر انہیں اور بھی مضبوط کر دیا کرتے۔

لیکن یہ سب دل بہلاؤ کے سامان تھے، یوں کہ ان مافعتی تدبیروں سے کچھ بھی ہنسا جاتا نہیں تھا۔ شہر میں ایسے ایسے ہولناک واقعات ہوتے کہ لگتا کہ بجلی کا زبردست شاک لگا ہے، اور عوام ہلچاؤں شانے چٹے ہو گئے ہیں۔

مثلاً یہ دیکھئے کہ الف نے چند در چند حادثوں کے بعد اللہ اللہ کر کے صبح کی گھر کے سبھی دروازے اور کھڑکیاں اندر سے مضبوطی سے بند کیں کہ اتنے میں زور و شور کے ساتھ ایک دروازہ آپ ہی آپ کھلا، اور کئی ایک دروازے دنگو لے اپنی اپنی الگ مہنتیاں لے گھر میں گھس آئے۔

ٹانے دڑانے کے لئے وہ اپنے محور پر چکر کاٹتے رہے۔ وقتاً یہ دیکھنے میں آیا کہ چند ایک سوکھے اجسام صرف چڑیاں باندھے سر کے بل گھر میں دوڑتے پھر رہے ہیں۔ ان میں سے کسی کی آنکھیں بیٹھ پر ہیں، کسی کی پیٹ پر اور کسی کی ماتھے پر۔ اتنے میں گھر کے ڈیڑھ سالہ بچے کی ٹانگ کراس کی شکل میں پیٹھ سے جا چکی ہے، اور وہ گول مٹول سی چیز بن کر ہوا میں معلق سا ہو جاتا ہے۔ تب ہی ان اجسام میں سے کوئی اسے اپنی ٹانگوں میں لے لیتا ہے، اور وہ اسے اسی طرح اٹھاتا ہے کہ وہ دوسروں کی ٹانگوں میں جا گرتا ہے۔ یوں وہ دیزنگ اسے اپنی ٹانگوں میں اُچھالتے رہتے ہیں۔ پھر وہ کسی طرح زمین پر آ رہتا ہے۔ بچے کے زمین پر آ جانے کے بعد وہ اسے ٹیبل ٹینس کا بال اور اپنی پتھیلیوں کو ریکیٹ بن کر اس سے کھیلنا شروع کر دیتے ہیں۔

بالآخر ایک زوردار اسٹروک پر بچہ اپنے بستر پر جا گرتا ہے۔ اس کی ٹانگیں آزاد ہو جاتی ہیں اور وہ خود بے ہوش ہو جاتا ہے۔

اچانک وہ سر کے بل کھڑے انسانی بیکر، میٹلے رنگ کے دھوئیں میں تبدیل ہو جاتے ہیں، اور ان کی آن میں وہ دھوئیں کی ٹیپہیں بڑے خوفناک لکڑی بگھوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ دروازہ جو ان کے آنے کے بعد بند ہو گیا تھا، اب ہی آپ کھل جاتا ہے، اور وہ لکڑی بگھے بھیا نکے جینیں بلند کرتے ہوئے باہر نکل جلتے ہیں۔ اور دروازہ دوبارہ بند ہو جاتا ہے۔

شہر کا ہر گھر اپنی ایک الگ داستان سناتا۔

ایک گھر کے بزرگ نے بتایا کہ دن کے وقت ان کا جی چاہا کہ ذرا پڑوسی کے یہاں سے ہوائیں بہت سارے تلخ تجربوں کے باوجود انہوں نے بڑی ہمت کی تھی۔ دروازہ کھولا تو سامنے کی چھت پر بہت سے انسان نما اجسام پیٹ کے بل اسی طرح دکھائی دئے کہ ان کی ٹانگیں دونوں جانب ایک دائرہ بناتی ہوئی ان کے کاندھوں سے چپکی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھ ان کی پشت پر بندھے تھے۔ ان کی آنکھیں اپنے کٹوروں سے نکل کر ان کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں، اور ان کے منہ سے کنکریوں جیسے بلبے نکل رہے تھے، جو باہر آتے ہی تیزی سے اپنا حجم بڑھانا شروع کر دیتے، حتیٰ کہ زمین پر گر گتے

تو بجاری پتھروں کی شکل اختیار کر لیتے۔

بزرگ کے گھر سے نکلے ہی ایک سل جیسا پتھر ان کے سامنے آگلا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سلوں کا ڈھیر ہو گیا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر اپنے دروازے کے اندر چلے گئے۔ ان کے اندر جاتے ہی سلوں کی بارش بند ہو گئی، اور تب وہ ساری پتھر کی سلیں برف کی سلوں میں تبدیل ہو گئیں اور تیزی سے پگھلنے لگیں۔ اس کے بعد انہوں نے عجیب تماشا دیکھا کہ وہاں سینے بھر پانی کا ایک دریا نکلا جو پانی کی دیواروں کے اندر قید تھا، اس میں کسی قسم کا تحریک نہیں تھا۔ بزرگ نے اندر سے دروازہ مقفل کر کے اسے اچھی طرح بند کر لیا، اور اپنی چار پائی پر آگے۔ اتنے میں ان کی چار پائی اور پراٹھ کر چھت اور فرش کے درمیان معلق ہو گئی۔

سارے دن کوچہ و بازار میں دیرینیاں گشت کرتیں، خاک کے تودے مست خرامیاں کرتے رہتے اور بدروحیں سارے میں گشت کرتی رہتیں۔ کسی نے ذرا کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش کی اور مٹا کہیں سے ایک پتھر آتا اور اس کی ناک کو لہو لہان کر جاتا۔

یہ شہر ۲۳ گھنٹے کا شہر تھا، کیونکہ ۲۳ گھنٹے گزرنے کے بعد گھنٹے بھر کے لئے ان بدروحوں کی عملداری ختم ہو جاتی تھی۔ اس گھنٹے بھر کے عرصے میں کیا کوئی ڈیڑھ سو میل کا سفر طے کر سکتا تھا؟ — کہ اس شہر کے ہر چاروں طرف حد نظر تک بجز علاقے تھے، جنہیں طے کرنے کے بعد ہی انسانی آبادیاں آتی تھیں۔ اس شہر سے انسانی آبادی کا فاصلہ کہیں بھی ڈیڑھ سو میل سے کم کا نہیں تھا۔

شہر میں بسیں اور دوسری سواریاں بھی چلتی تھیں، لیکن کوئی جی سواری ہو، وہ گھنٹے بھر میں نامحور راستوں پر ڈیڑھ سو میل کا سفر کس طرح طے کر سکتی ہے۔

بس ایک چھوٹا سا ہیلی کوپٹر تھا، جو ان کی رسد، ان کے بازاروں کے ضروری سامان اور ان کی ڈاک باہر سے لایا کرتا، اور جب واپس جاتا تو اس آسب زدہ شہر کی ڈاک اور وہ مصنوعات جنہیں لوگ بند مکانوں میں بیٹھ کے مل جل کے بنایا کرتے تھے، لے جایا کرتا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ایک شخص کسی طرح پائیلٹ کو ملا کہ شہر سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے چلنے کے بعد اس خاندان کے ان افراد پر جو شہر میں رہ گئے تھے، مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

جوں ہی ۲۴ واں گھنٹہ ختم ہوا، گھر کے سبھی افراد مکان میں بند ہو گئے۔ دفعتاً بند کھڑکیوں اور درازوں سے مشعلوں کے قافلے اندر آئے گئے۔ یہ مشعلیں ایک لمبی قطار میں اندر داخل ہوئیں اور انہوں نے اندر آتے ہی کمروں کا چکر لگنا شروع کر دیا۔ وہ اپنا دائرہ کبھی چھوٹا کر لیتیں اور کبھی بڑا کر لیتیں۔ پھر کچھ مشعلیں بھیتوں پر اٹھی لٹک گئیں۔

سبھی کمروں کا یہی حال تھا۔ وہ اپنی چار پائیوں پر بیٹھے تو انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان پر کھڑی کھڑی کیلیں بچا دی گئی ہیں۔

تب وہ اپنے عبادت خانے میں جا بیٹھے۔ شہر کے ہر گھر میں ایک کمرہ عبادت خانے کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا، جہاں لوگ اپنے اپنے طور پر عبادتیں کرتے اور ان بلاؤں سے نجات حاصل کرنے کی دعائیں مانگتے۔

چونکہ یہ بدر وحیں عبادت خانوں میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرتی تھیں، اس لئے شہر میں یہ رسم چل گئی تھی کہ جب لوگ ان بلاؤں کے ہاتھوں بے حد تنگ آ جاتے تو اپنے اپنے گھر کے عبادت خانے میں پناہ لیا کرتے۔

ساری رات وہ عبادت خانے میں بیٹھے رہے، اور ساری رات بد رنگ سے کفن میں ملبوس بدرو حیں کہ جن کے سر اپنی ٹکموں میں چلتی چٹائیں سلگائے، ان کے آگے چل رہے تھے، کمروں اور برآمدوں میں اپنی برہمی کا اظہار کرتی رہیں۔ ایسی بھیاٹک آوازیں بلند ہو رہی تھیں کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جنگل کے سبھی خوشخوار درندے ایک ساتھ ڈر رہے ہیں۔

دو تین دنوں تک وہ بے حد پریشان رہے۔ رات بھر چلتی مشعلیں ان کے کمروں کا طواف کرتی رہتیں، اور جب وہ اپنے عبادت خانے میں پناہ گزین ہو جاتے تو کفن پوش بدرو حیں، اپنے کٹے سروں کی رہنمائی میں ساری رات بھیاٹک چیخیں بلند کرتی رہتیں۔

پھر دن میں بڑے خوشخوار شکاری کتے اور لکڑ بگئے ان کے گھر میں گھس آتے، اور ایک ایک کو سونگھتے پھرتے۔ اور جب وہ کسی طرح ان سے بچ بچا کر عبادت خانے میں جا کر دم لیتے، تو برآمدے میں کھڑے ایسی دلخراش آوازیں نکالتے جو عام شکاری کتوں اور لکڑ بگموں سے یکسر مختلف ہوتیں۔

بارے کئی دلوں کی عبادت اور کئی دلوں کی دعاؤں کے بعد حالات کسی قدر نارمل ہوئے اور وہ پھر اپنے اپنے کمروں میں آ بسے۔

اسی طرح ایک شخص ڈاک کے قتلے میں گھس کر اس شہر سے بھاگ نکلا تھا، نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ۲۴ واں گھنٹہ ختم ہونے پر جب اس کے گھر والے، گھر واپس آ کر دروازے اور کمر کیوں میں قفل لگا چکے تو اچانک بڑے زور کی آندھی آئی اور جو جہاں تھا وہاں سے اڑتا ہوا فضا میں گشت لگانے لگا۔ ان میں سے کچھ لوگ چارپائی پر بیٹھے تھے، کچھ کرسیوں پر تھے۔ اور کچھ کھڑے تھے۔

ساری رات وہ اسی طرح فضا میں چکر کاٹتے رہے۔ فضا میں آگ کے بھیاںک شعلے ابھیں چاٹ جاتے اور اپنی پلپاتی زبان بڑھاتے، لیکن چونکہ وہ اللہ آئین کر رہے تھے، اس لئے وہ پھر لوٹ جاتے۔ صبح ہوئی تو وہ آندھیوں کے دوش پر اپنے مکان میں واپس آ گئے، لیکن یہاں عالم کہ جو جس پوزیشن میں تھا، اسی پوزیشن میں دیواریں چپکا رہا۔ اس کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، اور نیچے فرش پر کئی ایک بڑے اثر در دُم کے بل کھڑے ناچ رہے تھے، اور اپنے منہ سے آگ پھینک رہے تھے۔

دو چار فونٹک یہ سلسلہ جاری رہا، پھر جیسے بدرجہا نے اس حادثے کو بھلادیا، اور حالات اعتدال پر آ گئے۔

لیکن یہ کہنا کہ حالات اعتدال پر آ گئے تھے اپنی جگہ خود ایک مضحکہ خیز سی بات ہے، کیونکہ ۲۳ واں گھنٹہ ختم ہونے پر انہیں اخبار ملتا تو اس میں بڑی لڑخیز خبریں ہوتیں۔

اس اخبار کی اشاعت کا یہ دستور تھا کہ ہر گھر کا ایک ذمہ دار فرد اپنے گھر کے عبادت خانے میں بیٹھ کر گھر کی خاص خاص وارداتوں کو ایک بڑے کاغذ میں قلم بند کر لیتا، اور اسے وہیں عبادت خانے میں چھوڑ دیتا۔ یہ آپ بیتیاں عبادت خانے میں اس لئے لکھی جاتی تھیں کہ انہوں نے جب بھی انہیں اپنے رہائشی کمروں میں لکھنا چاہا تو یہ ہوا کہ کبھی کاغذ میں آگ لگ گئی، کبھی قلم نے اپنے منہ سے اس طرح روشنائی اگنی شروع کی کہ سارا کاغذ دیکھتے ہی دیکھتے رنگین ہو گیا اور کبھی یہ ہوا کہ کاغذ کی پیریاں بن کر ہوا میں اُڑ گئیں۔

۲۳ گھنٹے گزرنے کے بعد سبھی گھروں کی خبریں ایک خبر رساں ایجنسی کے حوالے کر دی جاتیں، جنہیں ایڈٹ کر کے وہ دوسرے دن اخبار میں شامل کر لیتے۔

۲۳ گھنٹوں میں وہ عام گھڑیوں سے کام لیتے، جن میں گھنٹے اور منٹ کا حساب ہوتا، لیکن جوہی ۲۳ واں گھنٹہ ختم ہوتا، وہ اپنی اپنی کلائیوں پر ایک خاص قسم کی گھڑی باندھ لیتے جن میں صرف سکندوں کا حساب ہوتا، کیونکہ اس شہر کا ہر فرد یہ جانتا تھا کہ یہاں ۲۳ گھنٹے خبیثوں کی حکومت ہوتی ہے اور ۲۴ واں گھنٹہ ان کا اپنا ہوتا ہے۔

ایک گھنٹے میں ۶۰ منٹ ہوتے ہیں، اور ہر منٹ میں ۶۰ سکند۔ اسی طرح گھنٹے میں ۳۶۰۰ سکند ہوتے ہیں۔ تو یہ خاص گھڑی سکندوں کی گھڑی تھی۔

اور ان ۳۶۰۰ سکندوں میں، ہلاکی تیز رفتاری کے ساتھ وہ سارے کام انجام دیتے۔ بازار، دفتر، بینک، خریداریاں، ملنا ملانا، شادی بیاہ، عبادت، تعزیت — سب کچھ اسی گھنٹے میں ہوتا۔

یہ وقت جو ان کے لئے خاص قیمتی ہوتا، اس کا پورا لیکھا جو کھا ان کے پاس ہوتا۔
۳۶۰۰ سکندوں کا۔

دفتر ————— ۱۲۰۰ سکند

بازار اور

دوسرے ضروری کام — ۱۲۰۰ سکند

ملنا ملانا ————— ۶۰۰ سکند

دلپسی ————— ۶۰۰ سکند

۳۶۰۰ سکند

زندگی کے اس عجبس میں ٹھنڈی ہواؤں کا یہ ایک گھنٹہ، دلوں میں تازگی لاتا، آنکھوں میں روشنی اور امید کا شہر آباد کر جاتا، اور انہیں زندگی کی معنویت سے روشناس ہونے کا ایک موقع بہم پہنچاتا۔

اخبار یا شہر نامہ وہ اپنے عبادت خانے میں پڑھا کرتے۔ اگر وہ انہیں اپنے گھر کے رہائشی حصے میں پڑھنے کی کوشش کرتے تو ان کی یہ کوشش رائیگاں جاتی۔
اس سلسلے میں مختلف واقعات رونما ہو چکے تھے۔

مثلاً ایک صاحب اپنی چارپائی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ اچانک روشن دان سے ایک سفید بوتر پھر پھر آتا ہوا کمرے میں چلا آیا (روشن دان اچھی طرح بند تھا) اور ٹھیک ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا۔ ان کی محویت ذرا کم ہوئی اور بوتر کی غمر سونوں رنگ گئی تو انہوں نے منہ کے سامنے سے اخبار ہٹایا، جہاں بوتر بیٹھا تھا، وہاں ایک زرد روجہ جیسی بلا، چڑی باندھے ننگ دھڑنگ نظر آئی۔ انہوں نے دل ہی دل میں کچھ پڑھا۔ تب ہی اس بلا نے ان کے ہاتھ کا اخبار نوچنا شروع کر دیا۔ وہ پورا پورا درق نوچ کر منہ کی طرف لے جاتی۔ منہ سے آگ کا شعلہ نکلنا اور چشم زدن میں اس ورق کو جلا کر خاک کر دیتا۔ اس طرح چند ہی ساعتوں میں وہ اخبار راکھ کا ڈھیر ہو گیا، اس کے بعد اس بلا کو روشن دان نے اسی طرح اپنی طرف کھینچ لیا، جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے۔ پھر اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ کدھر کو غائب ہو گئی۔

دوسرے ایک صاحب کا قصہ ہے کہ وہ اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ اتنے میں بند دروازہ زور سے کھلا، اور ایک بڑی خوفناک صورت کا بندہ کہ جس کی دُم میں آگ لگ رہی تھی دروازے سے نمودار ہوا اور اس نے جھپٹا مار کر اخبار ان کے ہاتھ سے چھین لیا، اور اسے اپنی دُم کی بھٹی میں جھونک دیا۔ پھر جدھر سے آیا تھا، ادھر ہی سے واپس ہو گیا۔

چنانچہ ان واقعات کے بعد لوگ اخبار بھی عبادت خانوں میں پڑھنے لگے۔ اخباریں انہیں ان کے شہر کے اتنے احوال مل جاتے کہ دوسرے شہروں کا احوال پڑھنے کی انہیں خواہش بھی نہیں ہوتی۔

ایک نوجوان خواب میں گلستاں کی سیر کر رہا تھا کہ یکایک اسے یہ محسوس ہوا کہ اس کے پلنگ کے برابر روشنی کا زبردست جھماکا ہوا، پھر روشنی کسی خوش گلوچھنے کی طرح گنگنا نے لگی۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ ایک سرتاپا قیامت اس کے پلنگ کے پاس کھڑی کچھ اشارے کر رہی ہے۔

نوجوان اپنے گھر والوں سے، دوسرے لوگوں سے اور اخبار کے ذریعے اتنی دلدوز خبریں سن چکا تھا اور پڑھ چکا تھا کہ اسے فوراً یہ خیال آیا کہ ہونہ ہو یہ بھی کوئی عشرتی جال ہے۔ وہ دل ہی دل میں اس سے نجات کی دعائیں مانگنے لگا۔

سرِ قامت دوشیزہ نے کہ جس کا شباب اس کے پیر بن سے پھوٹا پڑتا تھا، آہستہ سے اپنے زیریں جانے کا ایک کونا ادا پر اٹھایا۔ نوجوان نے دیکھا کہ وہاں بے پناہ بہاریں جلوہ گر تھیں، لیکن وہ چوکتا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے کوئی بھی غلط قدم اٹھایا اور ناک میں ملا۔

پھر چشمِ زدن میں اس کے سامنے حیات کا سرچشمہ تھا۔ نوز میں ڈھلا جسم — تب ہی ریشمی جامے دھواں بن کر اُڑ گئے، اور اب نوجوان کے سامنے سب کچھ تھا — بلندیاں، درختیں، نسیم پر آنے کی تدبیریں کر رہی تھیں۔ اور پستیاں جو بلندیوں کی طرف جانے کی راہ تلاش کر رہی تھیں — ایسا سانچے میں ڈھلا جسم نوجوان نے اس سے پہلے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ لیکن وہ ہوشیار تھا اور دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ کسی طرح اس سے نجات ملے۔ جب بھی ترغیبات اکام ہو گئیں تو نوجوان کو یوں لگا جیسے کہیں سے گندے نالے کی بو آرہی ہے، پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ لاتعداد مٹری لگی لاشوں کی بدبو اس کے شامہ کو ڈس رہی ہیں۔

اچانک وہ ڈھلا ڈھلا جسم کٹ کٹ کر گرنے لگا، اور دیکھے ہی دیکھتے اس کے سامنے ایک مکدرہ صورت ضعیف کھڑی تھی، جس کا سارا جسم بھریوں سے پٹا ہوا تھا۔ آنکھیں ہزاروں فرسنگ اندر کی طرف دھنسی ہوئی تھیں، اور سر پر چھدرے چھدرے سفید بال اُگے تھے۔

تب ہی کمرے میں ایک دردناک چیخ گونجی، مٹا کرے کی دیوار شق ہوئی اور ایک کمر خمیدہ ضعیفہ اس میں جا بسی۔

ہر گھر اپنی کہانی اخبار کو سوپ دیتا۔ اس طرح ہر گھر ایک لاتعداد کہانیوں والی کتاب بن گیا تھا۔ لیکن ۲۳ گھنٹے گزرنے پر جو ایک گھنٹہ یا ۶۰ منٹ یا ۳۶۰۰ سکند انہیں ملتے، ان میں وہ کوشش کرتے کہ زندگی کے سارے کام انجام پا جائیں — کفن، دفن، شادی بیاہ، سبھی کچھ —

ایک گھر کا قصہ ہے کہ جب دو لہا دو لہن جگہ عروسی میں ملے تو سیر کرتے کرتے دوڑوں ایک دوسرے کے چمنستان کی طرف نکل گئے۔ ابھی انہوں نے دو چار ہی جھلک اس کی دیکھی ہوگی کہ انہیں یوں لگا کہ تخت پر کفن اور مے ایک لاش پڑی ہے، چونکہ اس شہر کی لغت سے 'حیرت انگیز' لفظ نکال دیا جا چکا تھا، اس لئے انہوں نے اس کی طسرت کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اچانک اس لاش کے سینے سے خون کا فوارہ سا جاری ہو گیا۔

وہ لوگ یقینی کچھ بدحظ ہوئے ہوں گے، پھر بھی وہ سیر کر کے ہی لوٹے۔

'حیات کا انجام موت ہے'۔ لیکن اس درس کا یہ کوئی عمل نہیں تھا کہ یہ رات تو بقول شاعر بہت راتوں کے بعد آئی تھی۔

وقتاً فوقتاً مختلف گھروں میں لوگوں کے مرنے کی بھی خبریں ملتیں۔ لیکن ایک دو دھائی سال کے بچے کی موت بڑی حسرت ناک ہوئی۔ وہ ہاتھ روم میں سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ہاتھ روم کا دروازہ کھلا تھا کہ اچانک اس کے سامنے چھت سے ایک کانٹوں بھرا جانور اڑا۔ بچہ جو چھپکلی کے گرنے پر چیخ پڑا تھا، اس منظر کی کہاں تاب لاسکتا تھا۔ وہیں چیختے چیختے ڈھیر ہو گیا۔ گھر کے لوگ بھاگتے ہوئے آئے تو ایک کالی بلی ان کی ٹانگوں سے نکل کر بھاگ گئی۔ لڑکے کو کچھ دیر بعد ہوش آیا، لیکن وہ پھر کانپنے لگا۔ لوگوں نے بدن چھوا تو اسے بڑا تیز بخار تھا۔

بچے کو عبادت خانے میں لے گئے۔ کئی دنوں تک اس پر سرسامی کی کیفیت طاری رہی، اور اسی عالم میں وہ بچہ ختم ہو گیا۔

وہاں مردے کی تدفین بھی ایک زبردست مسئلہ تھی۔ ابتدا میں لوگ مردے کو مردہ طریقے سے دفن کر دیتے یا جلا دیتے، لیکن اس طرح ہوتا یہ تھا کہ بلائیں انہیں ان کے قبروں اور ان کے مر گھٹ سے اڑا لے جاتیں اور تب وہ لاشیں بھی اسی غزل بیابانی کا ایک حصہ ہو جاتیں۔ چنانچہ لوگوں نے کافی غور و خوض کے بعد یہ کیا کہ قبروں کے چاروں طرف ایک حصار بنادیتے، اور پھر چاروں کوئے پر

لکڑی کا ستون کھڑا کر کے ان پر آیات کریمہ لٹکا دیتے اور لوح مزار پر بھی آیات کریمہ کندہ کرا دیتے۔ مرگھٹوں میں کبھی تقریباً یہی رواج تھا، جہاں مُردہ جلایا جاتا، وہاں چار کوٹے میں چار کھجے نصب کر کے ان پر مقدس اشلوک لٹکا دیتے۔

اور یہ سارے کام ۲۴ ویں گھنٹے میں کئے جاتے۔ قبرستانوں میں گورکن ہمیشہ قبریں تیار رکھتے۔ کیوڑے کی قبلیں، گھرے اور اگر تیاں بھی وہیں مل جاتیں۔ اسی طرح مرگھٹ پر بھی لکڑی، گھی اور چندن وغیرہ کا انتظام رہا کرتا۔

قبرستانوں میں گورکن اور مجاور اور مرگھٹوں میں پنڈت اور آگ وینے والے ہر روز ۲۴ ویں گھنٹے، دفتر کے اوقات کی طرح پابندی سے پہنچ جایا کرتے۔

ہر گھر کفن کے علاوہ اپنی بساط کے مطابق کا فور، چائے کی پتی اور نیم کی پتی کا ڈھیر رکھا کرتا، اور اگر رات کو کوئی ایسا ویسا حادثہ پیش آ جاتا، تو لاش کو عبادت خانے میں نہلا دھلا کر کفن دے کر اس پر ڈھیر ساری چائے کی پتی ڈال دی جاتی، مزید احتیاط کے طور پر اسے کافور میں بسا دیتے، اور اس کے سر پر لہان اور دیگر اقسام کی خوشبوئیں جلا دیتے۔

جب عبادت خانوں میں مردے رکھنے کا رواج نہیں ہوتا تھا، تو گھر کے افراد کے درمیان سے لاش اٹھ جاتی تھی اور وہ محض بے بس و مجبور تماشائی بنے دیکھتے رہ جاتے تھے۔

ایک صاحب رات کے وقت اپنی چارپائی پر سوئے تھے ان کے گھر میں چھت کے اوپر روشن دان تھا، اور ان کی چارپائی ٹھیک روشن دان کے نیچے کبھی تھی۔ نیندیں انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے دوضبوط ساند آپس میں لڑ رہے ہیں، بڑی عجیب سی آواز تھی۔ ان کی آنکھ کھلی تو انہوں نے دیکھا کہ روشن دان سے تار جیسی دو کالی کالی ٹانگیں بھول رہی ہیں کہ جن کے سل جیسے تلوؤں سے روشنی پھوٹ رہی ہے۔ اچانک تلوؤں سے ساز کی آواز آنے لگی، اور تب گانے بجانے والوں کا پورا طائفہ چھت اور فرش کے درمیان ایک بٹے سے قالین پر نغمہ سرائی میں مشغول نظر آیا۔ دوسرے افراد جو اس کمرے میں سوئے تھے، وہ بھی اس بے وقت کی راگنی کے چھڑ جانے سے جاگ اُٹھے۔



**THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM**

**LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.**

ناگاہ کہیں سے ایک تلوار نمودار ہوئی اور وہ سازندوں اور گائے والوں کی گردنیں اڑا کر غائب ہو گئی۔ تب انہوں نے دیکھا کہ وہ کٹی ہوئی گردنیں اور وہ بے گردن کے دھڑان تلخوں میں جذب ہو گئے، اور آنسوئی ٹانگیں دھواں بن کر اسی روشن دان سے واپس ہو گئیں۔

گھروں میں اکثر ایسا ہوتا کہ لوگ کھانے کی میز پر کھانا کھا رہے ہیں کہ ایک دم سے بیزیر لانا چھپکیاں چکر کاٹنے لگتیں۔ عورتیں چیخے لگتیں اور مرد بھی بد مزہ ہو جاتے۔ آخر ان میں سے کوئی زیرک بول اٹھتا۔

”انہیں ہمارا مقدر سمجھو اور صبر و شکر کر کے کھاؤ۔“

لیکن وہ کھانا سبکوں کی طبیعت سے اتر جاتا، اور کوئی بھی دوبارہ میز پر بیٹھنے کا روادار نہ ہوتا۔

اکثر ایسا ہوتا کہ تورنے کے ڈونگے میں مری چھچھوند رکھائی دے جاتی اور سارا تور منامی میں پھینک دیا جاتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ کھانے سے انسانی فضلے کی بو آنے لگتی۔

ان سب واقعات کے بعد لوگوں نے عبادت خانے میں کھانے کا رواج شروع کر دیا۔

وہ کھانے کے کمرے کو ترک کر چکے تو باورچی خانے میں آسیبی کاروائیاں شروع ہو گئیں۔ گوشت کی بوٹیوں میں کیڑے بجھانے لگے، سبز یوں میں سڑاند پیدا ہو جاتی اور کبھی یوں ہوتا کہ پوری پوری دیکھی اڑ کر پانچخانے کی سیٹ میں جا گرتی۔ آخر انگیٹھیاں بھی عبادت خانے کے ایک کونے میں پناہ گزین ہو گئیں۔

ایسے موقعوں پر وہ سوچتے کہ اگر ان کے گھروں میں عبادت خانے نہ ہوتے تو پھر کیا ہوتا؟ لیکن یہ ۲۳ گھنٹوں کا احوال تھا۔ ۲۲ گھنٹے گزرنے پر وہ پورے ۳۶۰۰ سکند کے لئے آزاد ہوتے۔

یہ ۲۳ گھنٹے کا پتا ہوا صحرا، جہاں ہمہ وقت سر پر آگ برساتا ہوا سورج ہوتا اور قدموں تلے جھلستی ہوئی زمین ہوتی۔ جہاں پیاس کے مارے حلق میں کانٹے ہی کانٹے آگ آتے،

اور زبان سوکھ کر مسکوم ہواؤں سے مٹی کی خیرات مانگنے بے دست و پائی کے عالم میں تنہا باہر نکل آتی — وہاں یہ ایک گھنٹے کا نخلستان بڑا ہی زحمت بخش ثابت ہوتا۔

اسی دوران شہر میں ایک بڑا ہی دردناک واقعہ پیش آیا۔ ۲۴ دس گھنٹے میں ایک شخص پائیلٹ کی نظر بچا کر چپکے سے ہسپتال کو پٹریں جا بیٹھا کسی راہ گیر نے اسے دیکھ لیا اور پائیلٹ کو خبر کر دی۔ پائیلٹ نے اسے باہر نکال دیا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے جانے سے اس کا پورا خاندان ظلم و ستم کا نشانہ بنے گا۔

تب ۲۴ واں گھنٹہ ختم ہوتے ہی ہوا کا ایک زوردار جھونکا اسے اس کے گھر سے اڑا لے گیا۔ فضا میں پہنچ کر اس کا سارا جسم زنجیروں میں جکڑ گیا اور وہ خود سر کے بل آسمان میں چکر کاٹنے لگا۔ اچانک کہیں سے ایک کوڑا نمودار ہوا اور اس پر شاپس برسے لگا۔

جب وہ شخص بے ہوش ہو گیا تو کسی نے پکے سے اس کے منہ پر پانی کا پھینکا دیا اور اس کے منہ میں پانی کی دو چار بوند پکا دی۔ اسے کسی قدر ہوش آیا تو دوبارہ کوڑے برسے لگے۔

۲۳ گھنٹے ختم ہوئے تو وہ شخص آپ ہی آپ اپنے گھر میں آگرا۔ اس کا سارا جسم زخموں سے پھٹ چکا تھا۔ وہ بخار سے بہن رہا تھا اور اس پر مذہبی کیفیت طاری تھی۔

اُسے گھر کے عبادت خانے میں لایا گیا۔ اس کے جسم پر لیپ چڑھایا گیا، اور اسے کچھ دوا وغیرہ دی گئی۔

۲۴ واں گھنٹہ گزرتے ہی عبادت خانے کے چاروں طرف لوہے کی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔ کچھ لوگ اندر رہ گئے اور کچھ لوگ باہر۔

باہر والے سبھی سبھی اپنی چار پائیوں پر آ بیٹھے۔ تب ہی انہوں نے دیکھا کہ روشنی دان سے سیاہ بلیوں جیسی مانگین نکلیں اور بڑھتے بڑھتے فرش پر آجئیں۔ دھوبی کے پاٹ جیسے پاؤں رکھنے والی یہ بلا روشنی دان سے باہر گھر کے سامنے والے نیم کے درخت کی سب سے اونچی شاخ پر اپنا سر رکھے۔ بتعلق سے دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی ناک اور منہ سے گندے بلبے نکل رہے تھے،

محبس

اس نے کسی کل کو دبایا تو گنبد میں ایک راستہ بن گیا، جو اپنے ساتھ روشنی کی ایک چوڑی پٹی بھی لیتا گیا۔

اس شخص نے کچھ کھجوریں اس کی جھولی میں بھر دیں، اور پھر پانی بھرنا چھاگل دیتے ہوئے اس سے یوں گویا ہوا کہ وہ ایک ذہین اور طباع آدمی ہے، اور اسے یقین ہے کہ وہ دو چار گھڑی میں یا زیادہ سے زیادہ دو چار دن میں اس کل کا سراغ لگا ہی لے گا، جو اس تہہ خانے میں پوشیدہ ہے، اور جسے دباتے ہی یہ گھر کی کھل جلے گی، اور تب ہی وہ ساری قیمتی اشیاء جو اس میں بند ہیں اس کی ہوجائیگی — دولت و ثروت اس کے گھر کی باندی ہوگی۔

یہ کہہ کر اس نے اس سے الوداعی مصافحہ کیا، اس کے حق میں دعائے خیر کی اور 'خلا حافظ' کہہ کر اسے اس راستے پر ڈال دیا جو تہہ خانے میں جاتا تھا۔

اس کے نیچے اترتے ہی اوپر والے شخص نے کل کو دبایا، جس سے تہہ خانہ بند ہو گیا، اور وہ راستہ بھی کہیں غائب ہو گیا۔

تہہ خانے میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ایک قطاریں کئی الماریاں سونے کی سلوں، سونے اور چاندی کے ظروف اور ہیرے جواہرات کی بھینس، اور اس کی مخالف سمت کی قطاریں کئی الماریاں کتابوں کی بھینس۔
 ظاہر ہے کہ اگر یہ بیش بہا اشیاء نہ ہوتیں تو پھر وہ یہاں آتا ہی کیوں؟
 چنانچہ سب سے پہلے اس نے ان جلوؤں سے اپنی آنکھوں کو روشن کیا۔ اس کے دل نے خوشی کے شادیانے بجائے، اور اس کے ہونٹوں پر ٹھنڈے پانی کا چشمہ برسا ہو گیا۔
 اُس نے اس سرے سے اس سرے تک پھیلی ہوئی الماریوں کا جائزہ لیا۔
 الماریاں مقفل تھیں، اور قفل زنگ آلود ہو چکے تھے۔ اُس نے سوچا "خیر دیکھا جائے گا۔"
 وہ دالہا نہ انداز میں الماریوں کا معائنہ کرتا رہا، اور دل ہی دل میں ان کی مالیت کا اندازہ لگاتا رہا۔

اب وہ ایک بے حد متمول شخص ہو جائے گا۔ اتنا امیر و کبیر اتنا مالدار کہ.....
 اس 'کہ' کے بعد اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔ لیکن چند ہی ساعتوں میں اس نے بہت سے منصوبے تیار کر لئے اور اپنے ذہن میں خوابوں کی ایک جگمگاتی دنیا آباد کر لی۔
 کئی بار ان زرد جواہر سے بھری الماریوں کو دیکھنے کے بعد جب اسے اس بات کا اطمینان کامل ہو گیا کہ اب وہ چیزیں اس کی ہیں، وہی ان کا واحد مالک ہے، تو اس نے مقابل کی قطاریں کتابوں کی الماریوں کا جائزہ لیا۔ بے شمار کتابیں۔ وہ یہ سوچ کر خوش ہوا کہ اس علم کے خزانے کا بھی وہی اکیلا حقدار ہے۔

"جب دولت کی فراوانی ہو تو علم حاصل کرنے میں بھی لطف آتا ہے۔"

اور ابھی اس نے ایک ایک الماری کا جائزہ لیا۔ اُس نے سوچا کتابیں بھی یقینی نادر ہوں گی۔ اس نے کبھی خواب میں بھی اتنی دولت کا تصور نہیں کیا ہوگا، اور نہ کبھی یہ سوچا ہوگا کہ علم کا ایسا بیش بہا خزانہ اس کے ہاتھ لگے گا۔
 وہ شخص جو اسے یہاں لایا تھا، اس کا کتنا بڑا محسن تھا کہ اس نے اتنا بڑا خزانہ بھی اس کے سپرد کر دیا، اور اسے فروغ دینے کے لئے علم کی دولت بھی سونپ دی۔ تب ہی اسے اپنے محسن

کی وہ بات یاد آئی کہ تہہ خلع کے اندر بھی کل ہے جس کے دبائے سے تہہ خانہ کھل جاتا ہے —
دو چار گھری یا زیادہ سے زیادہ دو چار دن —

دو چار دن بھی ہوئے تو کوئی بات نہیں — آخر دنیا کا اتنا بڑا خزانہ یونہی تو نہیں باہتہ
آجائے گا — بس یہیں کوئی کل ہوگا —

گنبد نما چھت پر مگر ٹیوں کے جالے تنے تھے — چھت پر اس جالے کے شامیانے کے
علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا — کئی جگہ جالوں کی بڑی بڑی لٹیں آدیناں تھیں — چھت نہ ہوئی
برگد کا گھٹنا درخت ہوئی —

کافی دیر تک چھت کو تکتے رہنے کے بعد اس کی نگاہیں فرش پر اُتر آئیں، اور تب اس نے پہلی بار
دیکھا کہ فرش پر جابجا کئی ایک انسانی پتھر پڑے ہیں — اس کے منہ سے ہلکی سی 'شی' نکل گئی —

"یا خدا جب میں ان زرد و جاہرات اور کتابوں کی الماریوں کی سیر کر رہا تھا، اس وقت یہ ڈھانچے
کہاں تھے؟ — کیا شوق کی شدت میں یا انتہائی خوشی کے لمحات میں انسان بالکل سامنے کی
اشیا کو بھی فراموش کر دیتا ہے؟ — یا یہ ڈھانچے ابھی ابھی آئے ہیں؟"

تب ہی اسے یہ محسوس ہوا کہ وہ پتھر بھاری سرگوشیوں میں اُس سے کہہ رہے ہیں —
"ہم بھی کبھی اس بیش قیمت خزانے کے تنہا مالک تھے —"

اسی دم اس پر ایک آہنی رجائیت کا غلبہ ہوا، اور وہ آپ ہی آپ بول اُٹھا —
"گدھے اور نکمے تھے، آئے اور چپکے سے مر گئے، اور نہ اس ایک تہہ خلع میں اس کل کا
سُراخ لگانا کون سی بڑی بات ہے؟"

اور تب ہی ایک مرد دانے اس کے اندر سے نکل کر کہا —

"خزانہ تمہارا تھا، انہیں کس طرح ملتا — ان کے مقدر میں تو صرف موت تھی —"

اس نے شکر گزار لہجے میں کہا — "ہاں یہ ایک بات ہوئی — چلتے چلتے اس کل کا پتہ بھی
بتا دو —" جب تک وہ مرد دانا کہیں گم ہو چکا تھا —

یوں اب اس کل کو تلاش کرنے کی ذمہ داری صرف اس کی تھی — فرش پر ہر کونے کا تر کا

پیٹ میں شکستہ حال قبروں کا شور اُٹھ رہا ہے، تن پر ایک تعفن زدہ حال جھول رہا ہے۔
 منہ میں ایک 'ناواں سی' ہاں — آں، بھی گم جو چکی ہے، اور جسم کے ریگ ناموں میں محض
 کانٹے ہی کانٹے اُگے ہیں۔

ان حالات میں کون اس سے کہے کہ اُس کا تقاب کدو جو تہا را سب کچھ لے کر
 بھاگا جا رہا ہے۔



۱۹۷۲ء

اس نے بغور جائزہ لیا کہ شاید وہاں کوئی کل دبا ہو، لیکن فرش پر جا بجا ان پنجروں کے علاوہ جن کے گوشت و پوست ستر گل کر ختم ہو چکے تھے، اب کچھ نہ تھا۔

اس نے فرش پر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ہر جگہ اپنے پاؤں سے ٹھوکر ماری کہ شاید کہیں کچھ گھن گرج ہو، شاید فرش ہی پر کوئی کل چھپا دیا گیا ہو، لیکن ایک ٹھوس سی آواز کے سوا اسے کچھ سنائی نہ دیا۔

فرش کے بعد اس نے جالے بھری دیوار کو تقصیبا — چند غیر معمولی جُٹے کے مکڑے تیزی سے اوپر کی سمت بھاگنے لگے، چیونٹیوں کا لشکر کبھر گیا، اور اس کی سٹھیلیوں پر گرد کی تہہ جم گئی۔ وہ گھوم گھوم کر دیوار کو ٹھوک بجا رہا تھا۔ ایڑیوں کے بل کھڑے ہو کر اس نے دیوار کے اوپری حصے کو بھی آزمایا، لیکن کہیں بھی کوئی کل برآمد نہ ہوا۔

عرش و فرش اور دیواروں پر اسے کچھ نہ ملا تو اس نے الماریوں کا بغور جائزہ لیا، اور تب اسے یہ معلوم ہوا کہ الماریوں اور دیواروں کے درمیان اتنی جگہ چھوڑ دی گئی تھی کہ ایک آدمی قدرے دقت سے ان میں سما سکتا تھا۔

یہ دیکھ کر اسے ایک طمانیت بخش احساس ہوا — ”یقینی اب اس کل کا سراغ مل جائے گا“ سوچو کجغت نے کہاں چھپا رکھا ہے۔“

پہلے وہ جواہرات کی الماریوں کی پشت پر اپنی بنگل کی جانب سے داخل ہوا، یوں کہ اس کے پاؤں آگے جانے کی بجائے اس کی داہنی سمت جا رہے تھے، سناوہ ایک پنجرے سے ٹکرا گیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے پنجرے کو کھینچ کر باہر نکالا، اور فرش پر ڈھیر کر دیا۔ اور جب اسے نکال چکا تو اس نے دیکھا کہ قریب ہی ایک اور پنجرہ بھی کھڑا تھا۔

یہاں بھی ہر طرف جالے اور ان کی لمبی لمبی لٹیں تھیں۔ ان کے علاوہ مکڑے، چیونٹیاں اور دوسرے کیڑے مکوڑے — اور فرش پر نیز درو دیوار پر مٹی اور گرد کی تہیں، باہر کے فرش اور دیوار پر جی ہوئی مٹی کی تہوں سے زیادہ موٹی تھیں۔ اندر اسے بے حد گھٹن کا احساس ہوا۔

لیکن اسے کل کی تلاش تھی، جسے دباتے ہی یہ تہہ خانہ کھل جائے گا اور وہ باہر نکل جائے گا۔

مع سازد سامان (اس نے چپکے سے اپنے دل میں کہا)۔

کل دہ تلاش کر کے رہے گا، خواہ اس کے لئے اسے پاتال ہی میں کیوں نہ جانا پڑے۔

پاتال کہاں ہے ؟ —

اسی پکے فرش تلے ؟ — جانے کتنی گہرائیوں میں ہوگا ؟ —

پر اُسے جو کچھ کرنا ہے، بہت جلد کرنا ہے۔ آخر یہ کجوریں کب تک ساقط دیں گی، ادریہ

چھاگل کا پانی —

وہ الماری اور اس سے ملی ہوئی دیوار کو دیر تک ٹوٹتا رہا، دیر تک تھپتھپاتا رہا۔ نیچے

سے شروع کر کے اوپر تک پہنچتا، پھر اوپر سے ٹوٹتا ہوا، تھپتھپاتا ہوا پائے تک پہنچتا —

یہاں تک کہ ابتداء اور انتہا کا فرق مٹ گیا۔ پھر بھی کچھ نہ ملا۔ اس کے اندر غصے کی ایک لہریں دوڑ گئی۔

”کہتا تھا تہہ خانے میں تمہیں اسی طرح کا ایک کل ملے گا۔ کتنا وقت ہو گیا ابھی تک.....“

اور جب وہ جواہرات کی الماریوں کی پشت سے برآمد ہوا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ گرد

میں لپٹا ہوا، موت بن چکا ہے۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر سر، منہ اور ہاتھوں کی اچھی

طرح صفائی کی۔

’ابھی تو تلاش کی پہلی منزل ہے اور ابھی سے یہ حال ہے۔‘

اس نے فرش پر پونک ماری۔ شاید گرد کی اُوپر پرت ذرا پرے سرک گئی ہو، ورنہ عالم یہ

تھا کہ وہ ٹھس کی طرح وہیں دراز رہی، کیونکہ اس نے فرش سے علیحدہ اپنی ایک شناخت قائم کر لی تھی۔

”کیسے صاف کیا جائے؟“

”رومال؟ — لیکن رومال سے تو ابھی دھیر سارے کام لینے ہیں۔“

اس نے اپنے ہوش و حواس یکجا کئے تو اسے جابجا میلے پیلے بوسیدہ کپڑے دکھائی دئے۔

”اچھا تو یہ ان دھچرے کے کپڑے ہوں گے۔“

اس نے ایک کپڑا اٹھایا، اور اس سے تھوڑی سی جگہ کو اچھی طرح صاف کیا۔ پھر صاف کی

ہوئی جگہ پر پھسکا مار کر بیٹھ گیا۔

تب ہی اس نے قبیلے سے کھجور کے کچھ دانے نکالے اور انہیں آہستہ آہستہ کھانے لگا۔ اچانک اضطراری طور پر اس نے ایک گٹھلی گنبدنا بھت کی طرف اُچھال دی۔ مگر اسے خیال آیا کہ اگر اس گردوغبار اور جالوں کے آسمان کے درمیان کوئی کل بٹھیا ہوگا تو اس گٹھلی سے ٹکرائے پر یقیناً احتجاج کرے گا۔ آج اسے کھجور کی گٹھلی کا صحیح استعمال معلوم ہوا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بھت کو گھورتا رہا۔

کھانے سے فراغت پانے کے بعد وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا، اس طور پر کہ آنکھیں اوپر کی جانب مٹی مٹیں۔ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک اسی انداز سے اُس نے کئی چکر لگائے۔ وہ اپنی آنکھوں سے پوچھتا — ”تم نے کچھ دیکھا؟“ — اور ہر بار وہ ایک ہی جواب دیتیں —

”بیکار ہے وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔“

”خیر دیکھا جائے گا اللہ مالک ہے۔“

اور یہ کہہ کر اُس نے چھاگل سے تھوڑا سا پانی پیا، اور پھر نئے حوصلوں اور تازہ امیدوں کے ساتھ کتاب کی الماریوں کی پشت پر جو تنگ سی راہداری بنی ہوئی تھی، اس میں داخل ہو گیا۔ ادھر بھی گردوغبار اور جالوں کا سامنا تھا۔ ادھر بھی اسے کئی انسانی ڈھچرے۔ اب وہ ان سے کسی قدر آشنا ہو چکا تھا، اور اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اگر وہ وہاں کچھ دیر اور رہا تو یقین ہے کہ وہ ان سے باتیں کرنے کے قابل ہو جائے گا۔

”سالے کس طرح کوئے کا تر میں گھس کے مرے ہیں۔“

”مزنا ہی تھا تو شریف آدمیوں کی طرح فرش پر لیٹ کر مرتے۔“

لیکن شریف آدمیوں کی ترکیب پر وہ خود چونک اٹھا۔

”شریف آدمی اس بند تہ خانے میں، مُردوں کے اس دیار میں کیوں آتا؟“

کتاب کی الماریوں کی پشت پر بھی وہ دیر تک ایک ایک المدی کے پاس رک کر اور انہیں اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تک کئی بار منہ کر اور پچھتا پچھتا کر دیکھتا رہا کہ شاید کہیں وہ کل مل جائے، لیکن ادھر بھی اسے صرف مایوسی ہاتھ لگی۔

’کعبت نے پتہ نہیں دو کل کہاں چھپا رکھا ہے؟‘ — وہ زور سے بڑبڑایا، یا ممکن ہے دھیرے ہی سے بولا ہو — دراصل اس بند تہ خانے میں کہ جس کی چھت گنبد نما تھی، ہلکی سی ہلکی آواز بھی اپنا حجم بڑھاتی تھی۔

الماریوں کی قطار سے باہر نکلا تو ایک بار پھر وہ بھوت بن چکا تھا۔ اگر اس حالت میں گلی کے لڑکے اسے دیکھ لیں تو دور بھاگ کھڑے ہوں۔

ہاں ایک گلی ہوتی ہے، ایک محلہ ہوتا ہے، سڑک ہوتی ہے، شہر ہوتا ہے، آبادیاں ہوتی ہیں۔ لیکن اس عالم میں اسے یہ گمشدہ جلوے کیوں یاد آ رہے ہیں۔ یہ تو ایک ایسا بند تہ خانہ ہے جسے کھولنے والا کل ہی کہیں گم ہو چکا ہے۔

اور اگر کل ملے پردہ یہاں سے نکل بھی جائے تو یہاں آبادیاں اور کوچہ و بازار کہاں؟ — پتہ نہیں کس خدائی خوار نے اسے ایسی جگہ بنایا ہے، جہاں دوزنک ریت ہی ریت پھیلی ہے۔ یہ مقام تو گویا تاریخ کا ایک ایسا صفحہ ہے جس کے آگے پیچھے کے سبھی صفحے سادہ ہیں۔ نہ پیچھے کچھ ہوا تھا، نہ آگے کچھ ہو گا۔

یہاں تو اگر کسی کو مدد کے لئے آواز دینا چاہو تو یہ بھی بیکار ہے کہ یہاں تو دور دوزنک انسانی آواز کا کوئی سننے والا ہی نہیں ملے گا۔

کوئی سننے والا نہیں — ہاں مگر خدا۔ اور وہ دہیں خاک کی چادر پر سر بسجود ہو گیا۔

’بس تیری رحمت کا سہارا ہے، میں لایح میں پھنس گیا تھا۔‘ وہ دیزنک سجدے میں پڑا رہا۔ پھر جب اُس نے سجدے سے سر اٹھایا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا دل کسی قدر ہلکا ہو گیا ہے۔

اس کے سمجھ میں خاک بھر گئی تھی، چنانچہ اس نے خاک میں لتھڑا ہوا ٹھوک ایک بار جواہرات کی الماریوں کی سمت اور دوسری بار کتاب کی الماریوں کی سمت پھینکا۔ اور پھر وہیں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

تب ہی اچانک اس کے ذہن میں ایک بات آئی، اور وہ اپنے آپ پر تبھیلا اٹھا کہ یہ بات اس سے پہلے اس کے ذہن کیوں نہیں آئی تھی۔

”یہ تہ خانہ ہر طرف سے بند ہے، روشنی آنے کی کوئی راہ نہیں، لیکن پھر بھی تہ خانہ روشن ہے۔“

یہ سوچ کر ایک بار پھر اس کے اندر ہمت پیدا ہوئی — ’روشنی کے منبع کا پتہ چلانا چاہیے‘ یقینی اس راہ میں وہ کل بھی مل جائے گا۔

وہ غور کرنے لگا۔

روشنی ہمیں کہیں سے آرہی ہوگی — دیواروں میں کوئی شکاف نہیں ہے۔ فرش پر گرد و غبار کا ایک ستوازی فرش بن گیا ہے۔ گنبد نما فرش پر جاؤں کا شامیانہ کھینچا ہے، اور لمبی لمبی لٹیں لٹک رہی ہیں۔

سوچتے سوچتے وہ اس فیصلے پر پہنچا کہ ہونہ ہوان ہی الماریوں میں وہ روشنی کا منبع اور وہ کل چھپا ہوگا، جس کے استعمال کرنے سے راستہ کھل جائے گا، اور تب اتنے بڑے خزانے کا وہ اکیلا مالک ہوگا۔

لیکن الماریاں مقفل تھیں اور ان پر شیشے جڑے تھے۔

یہ زنگ آلود قفل تو ہتھوڑے کے بغیر نہیں ٹوٹ سکتے، بس ایک ہی طریقہ ہے کہ الماریوں کے شیشے توڑ کر ان میں تلاش کیا جائے۔
شیشے کس طرح ٹوٹیں گے؟

ٹکڑوں سے؟

پر دوسری ہی ساعت اس کے اندر کے ہوشمند فرد نے کہا۔

”میاں کس بھرم میں پڑ گئے۔ اگر شیشے اپنے ٹکڑوں سے توڑو گے تو ہاتھ بڑی طرح زخمی ہو جائے گا۔ اور اگر خون نہ بند ہوا تو؟ — اگر یہاں سے نکلنے کی ذرہ برابر ہی امید ہے تو خود کو ہر طرح بچانا ہوگا۔“

اُس نے سر ہلا کر کہا — ”تو ٹھیک کہتا ہے۔“ اور پھر شیشے توڑنے کے طریقوں پر غور کرنے لگا۔ کوئی اوزار نہیں — نہ لوہا نہ پتھر۔
 اچانک اسے خیال آیا کہ یہ جواتے سارے ڈھچر پڑے ہیں، کیوں نہ ان میں کسی کی ہڈی نکالی جائے۔

اس تہہ خانے میں جب بھی کوئی چھوٹا موٹا سا خیال اس کے ذہن میں پیدا ہوتا تو معاً اس کا دل اس کی تعریف و توصیف شروع کر دیتا۔

’وہ راستہ دکھانے والا ٹھیک ہی کہتا تھا۔ تو واقعی ذہن آدمی ہے۔‘
 تب اُس نے سامنے پڑے ہوئے کئی ایک ڈھچروں میں سے ایک ڈھچر کا انتخاب کیا جو نسبتاً بڑا تھا۔

اس نے ٹانگ کی ایک بڑی ہڈی کے متعلق فیصلہ کیا کہ وہ کارآمد ثابت ہوگی۔
 تھوڑی سی محنت کے بعد وہ ہڈی باہر آگئی۔

”واہ واہ کیا اوزار ملا ہے۔“ اس نے اس ڈھچر کو مشکراہٹ نکا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جیتے رہو میرے شیر، آخر تم کام آہی گئے۔“

اُس پر اُس کے دل سے آواز آئی — ”زندگی اور موت میں بس تھوڑا ہی سا تو فاصلہ ہے۔“
 وقت کا حساب کتاب وہ اپنی جھولی کی تیزی سے ختم ہوتی ہوئی کھجوروں اور تھپاگل میں تیزی سے نیچے اترتے ہوئے پانی کو دیکھ کر کر رہا تھا۔

پہلے اس نے جوابرات کی الماریوں کا رخ کیا اور ابتدا اُدھر سے کی جدھر سونے کی سلیں رکھی تھیں۔ اُس نے شیشے کو اچھی طرح توڑ کر اسے ہموار کر دیا تھا تا کہ سامان نکالنے میں کھروچے نہ لگیں۔ الماریاں سب ہی ایک جیسی وضع کی بنی ہوئی تھیں اور ان میں دونوں جانب تین تین شیشے لگے تھے۔ وہ شیشے توڑتا جاتا اور الماری کا سامان ایک کونے میں ڈھیر کرتا جاتا۔ اس طرح تھوڑی ہی دیر میں وہ الماری خالی ہو گئی۔

تب ہاتھ بجا بجا کر اس نے اوپر کے خانے، درمیانی خانے اور نیچے کے خانے میں روشنی

کے سوتے اندر اس کھل کی تلاش کی، جسے دباتے ہی یہ تہہ خانہ کھل جائے گا۔
وہاں کچھ نہ ملا۔

ابھی چار الماریاں سونے کی سلوں اور جواہرات کی اور پانچ الماریاں کتابوں کی باقی ہیں اور وقت کم ہے کہ وقت کچھوروں کی ایک جھولی اور پانی کی ایک چھالگل میں سمٹ آیا تھا۔
پہلی الماری کو اچھی طرح ٹھکانے لگا چکا تو اس نے سوچا۔
'مرے ہوئے یار کو کتنی زحمت دی جائے، اور یہ سوچ کر اس نے ڈٹھکر کی طرف اس کی ہڈی پھینک دی۔

اب اس کے ہاتھ میں سونے کی ایک بڑی سل تھی جس سے وہ دوسری الماری کے شیشے توڑ رہا تھا۔ پہلی الماری کی طرح وہ اس الماری کے بھی شیشے پر شیشے توڑتا رہا، اور سامان ایک کونے میں ڈھیر کرتا رہا۔

اس الماری کا بھی اس نے اچھی طرح جائزہ لیا — کل یہاں بھی نہیں ملا۔
"سلا فری، کھتا تھا، اسی طرح کا کل تہہ خانے میں بھی ملے گا۔"

تب اس نے ڈٹھوروں کے چاروں طرف بکھرے ہوئے بوسیدہ کپڑے اکٹھا کر لئے۔
"یہ داستان پارینہ کے بکھرے ہوئے باب ہیں اور اب یہ بھی کام آجائیں گے۔"

جب وہ ٹوٹے ہوئے شیشوں کے بڑے بڑے ٹکڑے سونے کی سلوں اور ہیرے جواہرات کے قریب رکھ آتا، تو مردوں کے ان بوسیدہ کپڑوں سے فرش کو اچھی طرح صاف کر لیتا کہ کہیں کوئی شیشے کا چھوٹا ٹکڑا، یا باریک ساریزہ بھی نہ رہ جائے کہ اگر بے خیالی میں پاؤں چیل سے باہر نکل گیا تو یہ نیچے نیچے ریزے بھی ان درو دیوار کی طرح اپنی پیاس بجھائے پڑ جائیں گے۔

وہ درو جواہر کی بھی الماریوں کے شیشے توڑ کر انہیں اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ اسے کہیں بھی کچھ ہاتھ نہ لگا۔

ایک کونے میں سیم وزر کا انبار لگا تھا۔ اس سے قریب ہی ٹوٹے شیشوں کا ڈھیر تھا، اور عالم یہ تھا کہ انسانی ڈھانچوں کے دریاں ایک زندہ فرد تھا، جو اس طرح گرد و غبار میں اٹا ہوا تھا کہ اگر

وہ آبادیوں میں نکل جاتا تو لڑکے، بھوت، ہوت، چلاتے ہوئے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے۔
وہ فرد جس کا وقت کھجور کے چند دانوں اور چھاگل کے دو چار گھونٹ پانی کی حدوں میں داخل ہو چکا تھا۔
— تہہ خانہ اب بھی روشن تھا۔

اس نے دل میں حساب کیا — ۷۲ گھنٹے تو یقیناً گزند چکے ہوں گے — تین دن اور
تین راتیں۔

’اللہ کا شکر ہے کہ ابھی میرے ہوش و حواس بچا ہیں، اور پاس میں کچھ کھجوریں اور تھوڑا
پانی باقی ہے۔‘

تب وہ کتابوں کی طرف بڑھا۔ ان کتابوں کو یقیناً اس کل کا علم ہوگا، مگر دوسری ہی ساعت
وہ یہ سوچ کر کانپ اٹھا کہ ہزاروں کتابوں کے اس خزانے کی چھان بین کئے تو ایک عرصہ چاہئے، اور
ان حالات میں تو اس کا دو چار دن جینا بھی مشکل نظر آتا ہے۔
پھر بھی اس نے اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیا۔

ادھر کی الماریوں کے شیشے بھی توڑ توڑ کر وہ پہلے ولے ڈھیر پر رکھتا جاتا، اور کتابیں
اس گوشے میں جو سونے چاندی اور جواہرات کے گوشے کے عین مقابل تھا۔
پہلی الماری خالی ہوئی تو اس نے کل کی تلاش شروع کی — سب بیکار —
پھر دوسری، تیسری، چوتھی اور پانچویں۔

کتابوں کی الماریوں کی بھی اچھی طرح جانچ پڑتال کر چکا تو پھر وہی بات اس کے دل میں آئی
کہ ہونہ ہو کل کاراز ان ہی کتابوں میں پوشیدہ ہے — کتابیں یہاں اسی مصلحت سے رکھی گئی ہونگی
کہ خزانہ حاصل کرنا ہے تو تہہ خانہ کے کل کو ان کتابوں میں تلاش کرو۔ لیکن لاتعداد کتابوں کے اس ذخیرے
کو کھنگانا کیا دو چار شانے یا دو چار دونوں کی بات تھی؟

شاید ایک ٹکڑا لٹرائے کے بعد ہی یہ ذخیرہ اپنے سینے کا راز اُگلے (اور وہ بھی کوئی حتمی بات
ہنسی کی جاسکتی) — اور وقت تو دراصل چند کھجوریں اور تیزی سے سوکھتی ہوئی چھاگل بن چکا تھا۔

اب ہر شے عریاں ہو چکی تھی — ایک طرف کی الماریوں نے ننگے ہو کر اپنی ساری دولت، اپنا سارا

بیش بہا اثاثہ ایک کونے کے سپرد کر دیا تھا، اور دوسری جانب کی الماریوں نے تنگے ہو کر کتابوں کی صورت میں اپنا سارا علم، ساری دانش ایک دوسرے کونے کو سونپ دی تھی۔

ان حالات میں اب یہاں بھائیں بھائیں کرتی الماریاں ہیں۔ ایک طرف سونے کی سلیں، سونے اور چاندی کے قیمتی ظروف اور ہیرے جواہرات ہیں، تو دوسری طرف کتابوں کا ڈھیر اور ان سے متصل شیشوں کا انبار۔ پھر جا بجا تنگے انسانی ڈھانچے اور ان کے ملگجے، بوسیدہ اور کرم خوردہ ملبوس۔ ان کے علاوہ تہہ خانے میں گرد و غبار، جالے اور ان کی منگنتی ہوئی شاخوں، مکڑوں، چیونٹیوں اور دوسرے کیڑے مکوڑوں کی عملداری تھی۔

اُس نے سوچا موت اور حیات کے درمیان صرف ایک لباس ہی تو حامل ہے۔

جب اس کی جھولی میں کھجور کے دو چار دانے اور چھانگل میں چلو بھر پانی بچ رہا تو اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ ان چیزوں میں ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔

معدہ خالی خالی ہوا تو اس کے سرنگھنے کی طاقت خاصی تیز ہو گئی۔ اور اب بوجو کتابوں کی تھی، بوجو ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کی تھی، بوجو اس مدتوں سے بند تہہ خانے کی تھی، بوجو گرد و غبار اور جالوں کی تھی۔ بوجو کیڑے مکوڑوں کی تھی اور بوجو انسانی ڈھانچوں کی تھی۔

یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان میں سے ہر بوجو باقی دوسری بوؤں کے سینے پر سوار ہے، اور یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں قوی تر کون ہے۔ دو چار دنوں کی بھوک اس کے شام کو اور بھی تیز کر دے گی، اس وقت شاید وہ اس لائق ہو جائے کہ اور بوؤں کے ساتھ ہی اپنی بو کا بھی احساس کر سکے، اور تب ہی وہ صحیح طور پر اس بات کا فیصلہ کر سکے گا کہ ان میں سب سے طاقتور بوجو کون سی ہے۔

مگر یہ روشنی جو کسی طور اپنے منبع کا پتہ نہیں دیتی ہے۔

کتابیں کیا کوئی پڑھے، نہ اتنا وقت ہے، نہ اتنا ہوش ہے۔

اس کے بعد اس نے تالوں کو کئی کئی جھٹکے دیے، سونے کی ریل سے بیٹا، لیکن انہیں نہ

ٹوٹا تھا نہ ٹوٹے۔

’مٹی کا تیل ڈالنے سے شاید ٹوٹ جاتے لیکن ...‘

’شاید ان تالوں ہی میں وہ کل پوشیدہ ہو جس کے متعلق اس دعا باز نے کہا تھا کہ اس کے دباتے ہی....‘

’کس چکر میں پھنسا یا سارے نے۔‘

اس نے پھر ایک بار گنبدِ ناچھت کی طرف نظر دوڑائی۔ اتنے جانوں میں کیا پتہ چلے۔ تب ہی اس کے ذہن میں یہ تدبیر آئی کہ الماری پر چڑھ کر دیکھا جائے، مگر یہ کہ زخمی شیشے کہیں اسے بھی زخمی نہ کریں۔

’اچھا تو یوں کریں‘ اور یہ کہہ کر اس نے چیتھڑوں کو اپنی چپلوں کی گرد اچھی طرح لپیٹا۔ پھر کچھ ڈھانچوں سے ان کے پاؤں کی بڑی بڑی ہڈیاں الگ کیں اور انہیں جا بجا ان چیتھڑوں سے باندھ کر ایک لمبی سی پھڑی تیار کی، اور اسے لے کر اندر آئیں کرتا ہوا، اپنے پاؤں بچاتا ہوا، ایک درمیانی الماری کے خالوں پر چڑھنے لگا۔

الماری کی چھت پر پہنچ کر، وہ بری طرح جانوں میں گھر گیا۔ آنکھ ناک کان اور منہ میں جالے ہی جالے بھر گئے۔ انہیں وہ اپنی آستین سے پونچتا رہا۔ اس کے بعد وہ اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے ہڈیوں کی پھڑی کو چھت پر لگمانے لگا۔ اس عمل میں کئی بار اوپر کی ہڈیاں جھول بھی گئیں، اور کئی بار اس نے انہیں آہستہ آہستہ نیچے کر کے ان کی گڑھ کو مضبوط بھی کیا۔

لیکن جالے بھرے عرش نے بھی بالآخر اسے مایوس ہی کیا۔ اور جب وہ بالکل تھک گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ چھت پر بھی کچھ لینے والا نہیں ہے، تو پھر وہ پھڑی پھینک کر نیچے کود گیا۔

اور وقت ہوتا تو اس تھوڑی سی اونچائی سے کوڑا اس کے لئے معمولی بات ہوتی، لیکن ایسے میں کہ اس کے پیٹ میں ایک دانہ نہیں تھا، اور اس پر نقامت طاری تھی، نیچے آنے پر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اب وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہا ہے۔

لیکن کچھ دیر اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد اس میں دوبارہ طاقت آگئی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ تہہ خانے کی دیوار توڑ دے۔

’دیواریں بے حد مستحکم تھیں، لیکن اگر میری ہمت حجام ہے تو یہ دیواریں بھی گھٹل سکتی ہیں۔‘

گل کی شب

وہ انتظامیہ میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے اور نئی آبادیوں کی سمت رہتے تھے جہاں فرنگیوں، نیم فرنگیوں اور اعلیٰ ہندوستانی افسروں نے بڑی بڑی کونٹھیاں بنائی تھیں۔ لیکن ایک خاص بات جو انہیں دوسرے افسروں سے کسی قدر الگ کر دیتی تھی وہ یہ تھی کہ مزاجاً و طبعاً وہ خود کو سرحد پر کھڑا محسوس کرتے تھے۔ کئی سال انگلستان میں رہ چکے تھے، اٹھنا بیٹھنا انگریزوں کے درمیان تھا لیکن کسی ایسی قدر کی تلاش جو گہرائیوں میں ملتی ہے، انہیں مشاعروں و عرس کی مجلسوں اور میلاد شریف کی محفلوں میں کھینچ لاتی۔ جہاں وہ تین بیس کا سوٹ پہن کر سر پر اونچی انگریزی ٹوپی جھاکر اور گردن میں سخت سا 'بو' لٹکا کر شرکت کرنے کو سخت خلاف وضع تصور کرتے تھے۔ ان صحبتوں میں وہ انگریزوں کا، اگر ٹی ہوئی پتلے کی ٹوپی، برکا پانچامہ اور ریشمی جرابیں زیب تن کر کے آتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک ریشمی رومال ہوتا، ایسا کہ پھیلے تو ایک جہاں بن جائے اور کٹے تو انگریز کے کی جیب کے ایک کونے میں آ رہے۔

انہوں نے گھر کے مولوی سے فارسی، عربی اور اردو کے اپنے درجوں کے سبق لئے تھے اس طرح

یہ کہہ کر اُس نے خدا کا نام لیا اور سونے کی ایک ریل اٹھا کر بچروں کو آواز دی —

’دوستو! تم بھی اپنی جون میں آ جاؤ‘ اور ایک ایک ریل سنبھال لو —

’اُدھم سب مل کر اس مضبوط دیوار کو ڈھا دیں‘ —

’ہم ہی نہ رہے تو یہ خزانہ رہ کر کیا ہوگا‘ —

’مگر کس کر آ جاؤ‘ — موت میں بھی ایک وقار ہونا چاہئے، یہ کیا کہ آئے اور چوہے کی طرح مگر گئے‘

تب اُس نے ایک کنارے کی الماری کو کھسکا کر دیوار سے ملادیا۔ اس طرح الماری کچھ اس جگہ سے قریب ہو گئی جہاں گنبد کا قوس ختم ہوتا تھا۔

اس کے بعد وہ سنبھلتا ہوا الماری کی چھت پر چڑھ گیا اور قوس کے خاتمے پر ریل برسائے لگا۔

وقتِ رخصت

میں تھا اور میرے مقابل میرا کزن علی تھا، اور سفر کے لئے گھر سے نکلنے میں صرف ایک گھنٹہ رہ گیا تھا۔ یہ وہ سفر نہیں تھا کہ جس کے بعد دو چار دن، دو چار ہفتے یا دو چار مہینے پر واپس آنا لازمی امر تھا، اور یہ وہ جدائی تھی، جس کے بعد دو چار دن، دو چار ہفتے یا دو چار مہینوں کے اندر دوبارہ ملنے کی امید ہو، کیونکہ حقیقت تو یہ تھی کہ ہم دونوں ایک بہت بڑی بساط کے انتہائی حقیر اور بے وقعت ٹہرے تھے، اور ہمہ وقت یہ سوچتے رہتے تھے کہ —

پھر اتنا دل دوستاں رہے رہے نہ رہے

میں نے علی سے کہا ”علی میں نے پچھلے دنوں ایک آسیب زدہ شہر کی داستان رقم کی تھی، جہاں کے بایسویں کو ۲۴ گھنٹے میں صرف ایک گھنٹہ آزادی کا ملتا تھا۔ وہ اس ایک گھنٹے کو بھی غنیمت جانتے تھے کہ ایک گھنٹے میں ۳۶۰۰ سکنڈ ہوتے ہیں۔ اس ایک گھنٹے کے لئے انہوں نے ایسی گھڑیاں رکھ چھوڑی تھیں، جو سکنڈ کے حساب سے چلتی تھیں۔ چنانچہ ۲۳ گھنٹے گزرے پر وہ سب اپنی اپنی کلائیوں پر سکنڈ والی گھڑیاں لگا لیتے تھے۔“

اس پر علی جو بڑے غور سے میری باتیں سن رہا تھا، کہنے لگا۔ ”تو فی الوقت ہم لوگ بھی سکند
والی گھڑیاں لگالیں۔“

لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا بولیں۔ دراصل اتنے غلوٹے وقفے میں کاروباری
باتیں تو ہو سکتی ہیں، لیکن جو باتیں ہم اس وقت کرنا چاہتے تھے، ان کے لئے تو بڑے پرسکون ماحول کی ضرورت
تھی۔ یہاں نو بہ حال تھا کہ ہماری کلائیوں پر بھاگتی دوڑتی گھڑیاں بندھی تھیں، اور دل اتنے بھرے ہوئے
تھے کہ سوچنا پڑتا تھا کہ کیا کریں۔ خود کو سنبھالیں یا آنسوؤں کو سنبھالیں۔
”خواب کی طرح سے یہ دن گزر گئے علی۔“

دھائی ماہ پہلے جب ہم ایک عرصہ مدید کے بعد اس شہر میں ملے تھے، تو دیرینہ ہم ایک دوسرے
میں پلٹے رہے تھے، اور جب قلب کی حالت تھوڑی بہتر ہوئی تھی تو میں نے علی سے پوچھا تھا۔ علی میرے بھائی،
تم تو بڑے حساب والے رہ چکے ہو، یہ بتاؤ کہ ہم لوگ کتنے دنوں بعد ملے ہیں؟
تب علی نے انگلیوں پر حساب شروع کیا تھا اور کچھ دیر بعد بولا تھا۔
”۲۵ برس، ۳ مہینے دو دن۔“

”صحیح حساب کیا تم نے۔ اتنی طویل جدائی تو ہزاروں سال پہلے کے لوگوں نے بھی نہیں تھی۔“
میں نے علی کی طرف دیکھا تو اس کے کالے گنے بال خزاں کی نذر ہو چکے تھے، اور سر کے ساحلوں پر
یہاں سے وہاں تک سفید اور کالی پٹیاں سی نظر آرہی تھیں۔ اس کا رنگ ماند پڑ گیا تھا اور دانت
علی نے کہا۔ ”دراصل ہماری آخری شہادت، شہادتوں کے ایک طویل سلسلے کے بعد انجام پاتی ہے،
سو میرے باب میں اوپر اور نیچے کے چند دانتوں نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔“
تب ہی علی کی دولہن اور بچے بھی مجھ سے ملنے آ گئے تھے، اور سلام کر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ
گئے تھے۔ علی نے ان کا تعارف کرایا تھا۔

”یہ بڑا میٹا جیم میڈیکل کے چوتھے سال میں ہے، وسیم ہائی اسکول میں، ندیم ساتویں جماعت
میں۔ بڑی بیٹی دروہہ بی۔ اے کر چکی ہے، اس سے چھوٹی شبانہ امسال انٹر کا امتحان دے گی اور
رخسانہ نویں جماعت میں ہے۔“

اس وقت میں نے محسوس کیا کہ علی کے سیاہ گھنے بال جسم کے سر پر آگئے تھے، اس کی رنگت و سیم نے لے لی تھی، اس کے موتی جیسے دانت ندیم کے حصے میں آگئے تھے، اس کی آنکھوں کی چمک و روانہ کو ملی تھی تو اس کی مسکراہٹ شبانہ کو اور اس کے بات کرنے کا انداز رخسانہ نے پایا تھا۔
میں سوچ رہا تھا، علی کی بہار اب اس کے بچوں میں اُتر آئی ہے۔ اس طرح ٹوٹنے کے باوجود، وہ نہایت مضبوطی سے جڑا ہوا ہے۔

علی مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ ”گھر اور اس کے در و دیوار۔ آنگن اور چھت۔ اور وہ جن سے اس کا جنم جنم کا رشتہ ہے۔ پھر شہر، اس کے کوچہ و بازار اور وہ سمندر جیسا دریا...؟“
اس پر میں نے علی سے کہا تھا۔ ”سب کچھ اسی طرح ہونے کے باوجود، سب کچھ اسی طرح نہیں ہے کہ ٹھہرے ہوئے پانی اور بہتے ہوئے پانی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔“

تب ہی علی کو جیسے کچھ یاد آگیا تھا۔ ”بھائی صاحب جب اس شہر میں.....“ علی نے ان واقعات کو چھیڑ دیا تھا، جن سے میں کما حقہ واقف تھا، سو میں نے سوچا کہ علی سے کہہ دوں کہ اس خنیں داستان کو دہرانے کا کیا حاصل کہ ماضی تو وہ سنگلاخ زمین ہے، جس پر تبدیلی کا کوئی کدال اثر نہیں کرتا، لیکن پھر اس خیال سے کہ میں اس کا بڑا بھائی ہوں، اگر اس کی زبان سے اس کا دکھ درد سن لوں گا، تو یقین ہے کہ اس کا دل ہلکا ہو جائے گا، میں نے اُسے روکنا مناسب نہیں سمجھا۔

”ایک مسلح ہجوم ہمارے تعاقب میں نکل کھڑا ہو، تو ہم نے اپنی کوٹھیاں، اپنی کاریں اور اپنا سارا اثاثہ دریا برد کر دیا، صرف بیوی بال بچوں کو بچالائے کہ یہ سب سے قیمتی سرمایہ تھے۔“

”..... اب قیمتی دھوپ کے اس شہر میں خدا کا شکر ہے کہ ہمیں دو وقت روکھی سوکھی مل جاتی ہے، تن ڈھانکنے کو کپڑے مل جاتے ہیں، سر پر ایک چھت ہے، اور بچے پڑھ رہے ہیں۔“

”..... پونجی سے پونجی بنتی ہے، لیکن یہاں تو ہم آٹھ نفوس کا ایک ایسا قافلہ لے کر آئے تھے، جس کے پاس صرف اللہ کا نام تھا۔“

علی جذباتی ہو گیا۔ ”اب میں محنت سے سرمایہ پیدا کرنے کی کوشش میں ہوں۔ مگر شاید.....“
اس ’شاید‘ کے بعد علی غالباً یہ کہنا چاہتا ہو گا کہ یہ ممکن نہیں دکھائی دیتا، یوں کہ اب وہ خزاں

کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔

معاذ مجھے وہ بھونزا یاد آگیا، جو بہار کے دنوں میں خرمیتیاں کرتا رہا تھا، اور خزاں کے دنوں میں شہد کی مکھی سے تھوڑے سے شہد کی بھیک مانگنے گیا تھا۔ آج اگر وہ بھونزا ہوتا تو نہایت ہی استہزائیہ انداز میں شہد کی مکھی سے کہتا۔ ”بی بی تم نے تو بہار کے دنوں میں سخت جانفشانی کی تھی، اور بہت سارا شہد جمع کیا تھا۔“

یہ کہانی آج بے معنی ہو گئی تھی۔

میں نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا اور علی سے یوں مخاطب ہوا۔

”علی یہ نہ بھولو کہ ہماری گھڑیاں اب تک ایک ہزار سکنڈ کھو چکی ہیں، میرے بھائی بہتر یہ ہے کہ ہم ان لمحوں کو یوں ضائع نہ کریں کہ یہاں جو لمحے آپ کی گرفت میں ہیں، وہی آپ کے ہیں، ورنہ سب کچھ ماضی، سب کچھ مستقبل۔“

”سوچو کہ ہم لوگ پچیس سال بعد ملے ہیں، اور اگر پھر اگلے پچیس سال کی بات کی جائے، تو کیا ہم لوگ اس وقت تک زندہ رہیں گے؟“

علی نے کہا۔ ”یہاں تو بیل کی خبر نہیں۔“

وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا تھا، لیکن ادھر کئی عارضے اس کی جان کو لگ گئے تھے۔ میں یقینی اس سے زیادہ صحت مند تھا، لیکن ایک بار جب ہم ایک چوڑی سڑک پار کر رہے تھے، تو علی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا، اس طور پر جیسے وہ مجھے سہارا دے رہا ہو، حالانکہ اس کی ضرورت علی کو تھی، تب ہی میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ بچہ بڑے کی مدد سے سڑک پار کرتا ہے، لیکن وہی بچہ جب ایک خاص عمر سے تجاوز کر جاتا ہے تو پھر اس کے چھوٹے اُسے سڑک پار کراتے ہیں۔ میں بھی تو علی کا بڑا بھائی تھا۔

اُس دن میں اس کے ساتھ ایک لمبے سفر پر جا رہا تھا۔ اُس کے پاس چونکہ گاڑی نہیں تھی (کہ وہ تو اپنی کاریں دریا برد کر آیا تھا)، اس لئے ہمیں بس سے جانا تھا۔ بڑی مشکلوں سے ہمیں ایک مینی بس ملی، جو پہلے ہی سے بھری ہوئی تھی۔ مجبوراً ہمیں کھڑے کھڑے سفر کرنا پڑا، دیسے کھڑے کیا

خاک تھے، ہم تو دراصل رکوع میں تھے، اس واسطے کہ بس کی چھت بے طرح نیچی تھی۔ کچھ دور چل کر گاڑی رُکی اور ایک سیٹ خالی ہوئی، تو علی نے مجھے اس پر زبردستی بیٹھا دیا، حالانکہ وہ مجھ سے زیادہ نفد کا ہوا تھا۔ اس پر میں نے سوچا، علی واقعی مجھے خود سے کمزور سمجھتا ہے، لیکن دوسری ہی ساعت مجھے یہ خیال آیا کہ ممکن ہے اس نے سوچا ہو کہ پہلے بڑے بھائی کو بیٹھنا چاہئے، پھر یہ کہ میں اس کا جہان بھی تھا۔

”علی کچھ بلو میرے بھائی، دیکھو یہ گھڑیاں سخت بے وفا ہوتی ہیں۔ چشم زدن میں دو ہزار سکند گزر گئے۔“

لیکن ہم لوگ بس ایک دوسرے کو تنگ رہے تھے۔ شاید ہمیں ماضی قریب کے وہ ڈھائی مہینے یاد آ رہے تھے، جن میں ان مرد سال کو یاد کرنا ہمارا بہترین مشغلہ تھا جو پچیس سال ادھر بستے تھے۔

عزیزوں اور قرابت مندوں سے گذر کر ہم میلوں ٹیلیوں کی باتیں کرنے لگے۔

اچانک ایک دن علی پوچھ بیٹھا۔ ”بتھکیں اب بھی اڑتی ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں اب بھی بتھکیں اڑتی ہیں، اب بھی شنو ساری کا ہتھوار آتا ہے، لیکن چونکہ دوسری دپھیاں بڑھ گئی ہیں، اس لئے اب تمہارے وقتوں کا زور نہیں ہے۔“

اتنے میں علی کی دوہن نے مجھے ایک پکیٹ لا کر دیا۔

”بھائی صاحب یہ ایک حقیر تحفہ ہے۔“

پویشجن کے پکیٹ سے ایک قمیص، ایک تکیوں کا پیس اور ایک گھڑی والا قلم جھانک رہا تھا۔ قلم تو شاید اس لئے تھا کہ میں اپنے غم کی داستانیں لکھتا رہوں، لیکن یہ کپڑے؟

تب ہی میں نے علی سے کہا۔ ”علی تمہیں ان حالات میں یہ سب نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

علی آبدیدہ ہو گیا۔ ”بھائی صاحب آپ اتنے دنوں بعد آئے تھے، میں تو کچھ بھی نہیں کر سکا آپ کے ساتھ۔“

میں نے اس کی بیٹھ پھینک دی۔ ”علی یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ سوچو کہ بہ فرض محال ہم اگلے پچیس سال تک زندہ بھی رہے، تو کیا ہم اس لائق رہیں گے کہ ایک طویل فاصلے کا بار سہہ سکیں۔“

”معذروں کی کرسی پر بیٹھ کر آنے کا حاصل کیا ہوگا میرے بھائی“

”بس اب پانچ سو سکند اور رہ گئے ہیں کچھ باتیں کرو۔“

اچانک علی کھڑا ہو کر مجھ سے بغل گیر ہو گیا، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اس کے بعد مجھے بھی

ضبط کا یارا نہیں تھا۔

تب ہی ہم نے ایک دوسرے کی پیشانیوں کو بوسہ دیا۔

علی نے کہا۔ ”یہ وہ پیشانیاں ہیں جن پر ہمارے باپ دادا کی ہر سبقت ہیں۔“

”خوش نصیب ہیں آپ کہ بزرگوں کی قربت حاصل ہے، کبھی کبھار میری طرف سے بھی فاتحہ

پڑھ لیا کیجئے۔“

اب وہ گھڑیاں بند ہو چکی تھیں، اور ہم اپنی غم آسمکیں لئے، ایک طویل جدائی کی سمت نکل پڑے تھے۔

آخری سطرین

اُس کی جمبولی میں دو چار کھجوریں، اور چھاگل میں تھوڑا سا پانی رہ گیا ہے،
لیکن اس عالم میں بھی وہ محبس سے نکلنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔
وہ کسی بڑی حقیقت کی تلاش میں قرعے قرعے اور جنگل جنگل مارا پھرا رہا ہے۔
لیکن دوسری طرف —

مصائب میں گرفتار ہونے کے باوجود، وہ اپنے ہی جیسے دوسرے
ستم زدہ کے بازوؤں پر حریصانہ نظر رکھتا ہے،
اور ایک آسیب زدہ شہر میں آزادی کے چوبیسویں گھنٹے کو بھی اپنی
کم نگہی کے سبب ضائع کر دیتا ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ کبھی اجتماع کو فرد کی ضرورت ہوتی ہے، اور کبھی
فرد کو اجتماع کی۔

لیکن ہر حال میں ہمیں اس روشنی کی ضرورت ہے، جو دلوں کو منور
کرتی ہے، جو ہمیں راہ کے پیچ و خم سے آگاہ کرتی ہے، اور جس کے جلو میں ہم، خیالوں
کی بزم آراستہ کرتے ہیں۔
احمد یوسف

اُن زبانوں کی شاعری، ادبیات اور حکیمانہ ابواب ان کے خون میں رچ بس گئے تھے۔ چنانچہ انگریزی زبان و ادب اور قانون کی تعلیم نے ان کے اندر جہاں ایک توازن کی کیفیت پیدا کر دی تھی، وہاں ایک کیفیت ”کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے“ کی بھی پیدا کر دی تھی۔

وہ اپنی بارونق حویلیوں کو آباد اور گرم چھوڑ کر سرکاری کوشی میں جا بسے تھے۔ اس لئے فرداںی اور پیل انھیں دونوں جانب سے میسر تھی، یعنی ان کے اندر کا ایک فرد تو یہ کہتا تھا کہ فرنگی کی یہ نوکری میرے لئے کیا ہے؟۔ میری زمینداریاں، میری حویلیاں، میرے باغات، میرے کٹرے، اصل تو میرے لئے یہ ہیں۔ تب ہی اچانک دوسرا بول اٹھا۔ ”میں تو اتنی بڑی سرکار میں ایسے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوں۔ کوشی، بنگلہ، موٹر، بگھی، چیر اسی، خانساں، خدمتگاراں نہیں ہے میرے پاس؟۔ یہ میری آبائی جائیداد کیا خاک میرا تہہ بڑھلے گی۔“

یہ فراغت اور فرداںی طبیعت میں بڑی جولانی اور اُٹنگ لاتی ہے۔ یہ جو میرے پیچھے آ رہے ہیں اُن کی حیثیت کسی جم غفیر کی توہنیں ہے یہ تو ایک بڑا لشکر ہے اور میں ایک فاتح ہوں جس نے اس فوج کی کمان سنبھال رکھی ہے۔ میرے سینے پر یہ تمام تنے ہی تنے ہیں اور میں جوش و دلولے سے سرشار آگے کی طرف بڑھتا جاتا ہوں۔

مشاعرہ مغرب کے بعد سے شروع ہو کر نصف شب کے قریب ختم ہوا تھا۔

بگھی کا روغن تازہ تھا۔ نقش و نگار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ گھوڑے خوب سبھے سجائے تھے۔ کوچوان اور خدمتگاراں وردی میں تھے، اندر منیجر اور مصاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔ یہ مصاحب حواصل انھیں پرانے شہر کی روایتوں کو برقرار رکھنے کے صلے میں ملا تھا۔ انھیں کبھی کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ اس کا ساتھ رہنا کس قدر ضروری جی ہے۔ شرفا میں دھیمے لہجوں میں گفتگو کرنے کا رواج ہے۔ ایسے میں کوئی تو ایسا ہو جو اُن کی گفتگو کو اپنے سروں میں اٹھائے اور سارے عالم میں اس کی تشہیر کرے۔ فراغت اور اطمینان نے جو عقیدہ انھیں سونپا تھا وہ یہ تھا کہ جو دنیا جا رہی ہے وہ بھی اچھی ہے اور جو دنیا آچکی ہے یا آ رہی ہے وہ بھی اچھی ہے۔

کسے کسے گھوڑوں کی ٹاپ زیادہ تیز تھی یا ساز و سامان کی ریم جھم۔ لیکن یہ کہ آہنگ

دونوں سمت سے بلند ہو رہا تھا۔

اس تہذیب نے ان عورتوں کو جو کسی کی نہیں تھیں اور سب کی تھیں بالا خانوں پہ بٹھا دیا تھا۔ اس پرانی آبادی کی تنہا شاہراہ پر وہ چوک اور دوسرے کئی علاقوں میں خاصی بڑی تعداد میں آباد تھیں۔

مشاعرے کی باتیں مغزلوں پر تبصرے اور شعراء کے خصائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ ساتھ والے یہ کرتے کہ جب وہ تھک کر چپ ہو جاتے تو وہ ان کے دیئے ہوئے خطوط کو اور گہرا کرنے کی کوشش کرتے، جب تک کہ وہ "ہوں" نہ کہیں۔

آغاز گرا کی اتھی جب کہ کبھی پورا با چلتی ہے جس میں پینے پر پیاس اور بھرکتی ہے ہر چند کہ اس ہوا کا جسم نرم اور گلاز ہوتا ہے، اور کبھی کچھوا چلتی ہے گرم اور دھکتی ہوئی مگر پینے پر پیاس بھتی ہے۔ پر یہ کہ شراب کی تاثیر دونوں میں ہوتی ہے۔

اس رات پورا جل رہی تھی جو سوکھے زخم کو ہلکا کرتی ہے۔

بگھی مشاعرہ گاہ سے بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ انہوں نے گلا صاف کرتے ہوئے اپنے ساتھ والوں سے پوچھا۔ 'ڈیرے دارنیاں تو اب سو چکی ہوں گی۔'

مصاحب نے کہا۔ 'سرکار رو دسا کے اڈے تو پیچھے چھوٹ گئے۔'

اچھ۔ چھا۔ تب ہی انہوں نے بگھی سے سر نکال کر دیکھا۔

چاروں اور کوٹھنوں کا بازار سرد پڑ گیا تھا۔ رات سرسراہٹ ہوئی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ پہلی پہلی ہواؤں نے ساری آبادی کو سلادیا تھا۔ بس دو چار ادھر ادھر جاگ رہے تھے۔ ایک ادھ یوٹاری جن کے طرف ستائیس میں بھی صدائیں بلند کرتے، گجرے ٹکائے دو ایک پھول والے خلی شکر پر چلتے دو ایک راگمیر اور دو کانوں کے ادٹے پر سوئے ہوئے لوگ۔

پاس ہی انہیں ایک کچا سا بے مرمت سا کوٹھا نظر آیا، جہاں کرسی بچائے لائین کی روشنی تلی، اپنی سوچوں میں غرق ایک سانولی دکھائی دی۔ انہوں نے کوچوان کو آواز دے کر گھٹی رکوائی اور اس پورے منظر کو جیسے ذہن نشین کر لیا۔ — اولیٰ میں ٹکی ایک لائین کہ جس کے نیچے کرسی بچائے

ایک سانولی بیٹھی ہے۔ بے رونق سا، بے مرتب سا کچا کوٹھا، بہت تنگ و تنگ سی وسعت والا۔ اس سے آگے اس منظر نے کچھ بتانے سے معذرت طلب کی۔

اور جب کبھی ٹھہر گئی تو انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "اُو ذرا خدا کی اس مخلوق کو بھی دیکھ لیں۔"

ان دونوں کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا۔ شرفار کے جانے کی جگہ تو پیچھے چھوٹ گئی۔ اور یہ کتر درجے کی زندگی ہے جو ایسے علاقے میں بستی ہے جو اہل ثروت کے لئے یکسر ممنوع ہے کہ یہاں معمولی درجے کے لوگ آتے ہیں اور پرہیزگاری نام کی شے سرے سے معقود ہے اور چونکہ یہاں شرفار کا آنا جانا نہیں ہوتا اس لئے یہ لوگ گندی اور بدتمیز ہوتی ہیں اور یہ کہ بہت سی بیماریاں۔ لیکن ان کے پیور دیکھ کر وہ لوگ کچھ بھی تو نہیں بول پاتے۔

مینجور دایر کو ہچکچایا تو انہوں نے قدرے ادب سے لہجے میں کہا: "آئیے، اترئیے۔" جب ہی وہ سب چل پڑے اور خد منگوار کار بانڈ کی روشنی جلا کر پیچھے ہولیا۔ کوٹھے کے نیچے پہنچ کر انہوں نے ایک لمحے کو رُک کر زینہ تلاش کیا۔

زینہ کچا اور ناہموار تھا اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ اگر دونوں قدم ایک ساتھ رکھ دیئے گئے تو زینہ بیٹھ جائے گا۔ سڑک سے کھلے نالے کا جبکا سیڑھیاں چڑھتے وقت ان کے ساتھ ہولیا تھا۔ تین چار زینے کے بعد اندر کی دنیا صاف صاف نظر آنے لگی اور جب وہ زینہ اُٹے کر کے برآمدے میں آگئے تب انہیں اس بات کا علم ہوا کہ چھت چھوٹی ہے اور اس کا سینہ ہر ہر قدم پر دہل اُٹتا ہے۔

تب ہی اس ایک منظر نے کادوتی تلے ایک لائٹن لنک رہا ہے اور لائٹن کے نیچے کمر سی پر ایک سانولی سی لڑکی بیٹھی ہے۔ اچانک پہلو بدلا اور اب وہ لڑکی انہیں جھک کر سلام کر رہی تھی۔ معاً اس نے اپنی ماں کو آواز دے کر کہا کہ "دیکھو کون آیا ہے۔" اور ماں نے ایک سوتے ہوئے چھوکرے کو اٹھا کر یہ خبر دی کہ دیکھو کون آیا ہے۔

چھوٹے سے برآمدے میں ایک طرف ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ ادھر طر عمر عودت دور کر کہیں سے

ٹین کی ایک کرسی لے آئی۔ چھوڑ کر اپنی ران کھجاتا ہوا اٹھا اور جس دری پر لیٹا تھا، اسے اٹھا کر باہر تخت پر بکھپا آیا۔

عورت نے کرسی بڑھاتے ہوئے کہا: 'تشریف رکھئے سرکار۔ آپ میرے گھر آئے....' عورت نے شرفاء کے لئے بھی کچھ سبق سیکھ لئے تھے کہ شاید زندگی میں کبھی کام آجائیں، اور یہ سبق اس نے اپنی لڑکی کو بھی سکھا دیے تھے۔

وہ اس تکلیف دہ کرسی پر بیٹھ گئے جو ایک ناہموار سے فرش پر اونچی نیچی سی محسوس ہو رہی تھی۔ مینجر اور صاحب تخت پر بیٹھ گئے خدمت گزار روشنی لے کھڑا رہا۔

لڑکی بھی مودبانہ کھڑی تھی اس طرح جیسے اپنا سراپا دکھا رہی ہے۔ خاموش خاموش سی۔

برآمدے میں لائٹن کی روشنی کو ایک اور رفیق ملا۔ تو اس نے خود کو کچھ اور دکھایا۔ پروں والا ایک بُراق۔ پر بہت اٹھلے ہومان۔ ایک طرف فریم کیا بچا 'اوم' دوسری طرف 'اللہ' کا ٹھنڈا۔ اور بھی کئی ایک انل ادبے جوڑ تصویریں۔

برآمدے سے ٹی ایک نیم تاریک سی کوٹھری تھی جو ایک طرف تو برآمدے میں کھلتی تھی اور دوسری طرف ایک چھوٹی سی چھت پر جس سے ملحق باورچی خانہ اور غسل خانہ یہیں سے دکھائی دے رہا تھا جسے تھوڑی بہت روشنی ملتی تھی تو اس برآمدے کی لائٹن سے اور باورچی خانے کے جلنے ہوئے دئے سے۔ یہی چھوٹی سی دنیا ہے جو کچے دودھ دیوار کی سوندھی سوندھی بو، نیچے بہتے ہوئے مٹے کے گاہر بگاڑے 'سراییمہ' سے بھیکے اور باورچی خانے کی پھلتی ہوئی پیاز اور لہسن کی خوشبوؤں سے بسی ہوئی ہے۔

تب ہی خدمت نے بڑھ کر کہا 'سرکار پان حاضر ہے' ٹین کی ایک ہلکی سی چمکدار طشتری میں چند ایک بیڑے سجے تھے۔ سرکار نے ایک بیڑہ اٹھا کر ہاتھ میں دے لیا۔

عورت پھر تخت والوں کی سمت بڑھ گئی اور جب وہ کوٹھری کی طرف جانے لگی تو انہوں نے اونچی آواز میں کہا: 'ہاں یہ لیتی جاؤ'۔ انہوں نے انگرکھے کی جیب سے ایک چھوٹا سا بٹومہ نکالا اور ملکہ کے دور و پہلے طشتری میں ڈال دیئے۔ عورت نے جھک کر سلام کیا۔

تب ہی لڑکی آگے بڑھی اور اس نے چھوڑے سے کچھ کھسکھس کر کی۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ

جھٹکا سا پنک جو دیوار سے لگا کھڑا تھا، بچیا جا جا رہے، مچان سے گدا اور تکیے اُتارے جا رہے ہیں۔ ایک جانب پردہ لٹکا جا جا رہا ہے۔ باورچی خانے کا چراغ کوٹھری میں لا کر رکھا گیا ہے اور اور یہ سب کرنے کے بعد لڑکی باہر نکلی اور اس نے دھیرے سے کہا۔

”سرکار تشریف لے چلیں“

انہیں جیسے ہوش آگیا اور انہوں نے خفیف ہو کر کہا۔ ”ہنیں نہیں یہ سب کیا۔ میں تو بس یوں ہی آگیا تھا۔ تم لوگوں نے غلط سمجھا۔“

یہ سن کر لڑکی چپکے سے اندر گئی اور کچھ آہستہ مسروں میں اور کچھ تیز مسروں میں ماں سے بولتی رہی۔ اس کے بعد ہتھیلیوں کو طشت سا بنا کر اور اس پر دونوں رو پہلے سجا کر ان کے پاس لائی اور جھک کر ملائم لہجے میں بڑے ادب سے بولی۔

”سرکار کینز رنڈی ضرور ہے، مگر حرام کی کمانی نہیں کھاتی.....“

تب جیسے وقت ٹرک سا گیا ہو اور سائے نے اپنی سائیں روک لی ہوں۔

چند ساعتوں کے بعد اچانک سنلے چوٹکے اور ان ہی زمیوں سے سنبھل سنبھل کر نیچے سڑک پر آگئے جہاں میونسپلٹی کے مٹی کے تیل سے جلنے والے میپ پوسٹ یہاں سے وہاں ہنگ روشن تھے، کیونکہ ان دنوں شہر میں بجلی نہیں آئی تھی۔

(یہ کتاب بہارِ اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے)

پہلی اشاعت:	۱۹۸۴ء
تعداد:	ایک ہزار
صفحات:	ایک سو چالیس
خوشنویس:	ابوالکلام عزیزی
مطبوعہ:	پٹنہ لیتھو پریس، رمنہ لین، پٹنہ
قیمت:	بیس روپے

جملہ حقوق بحق شمیم یوسف محفوظ

میلنے کے پتے:

بک اسوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۷
 عرفان یوسف، صدر گلی، پٹنہ ۸۰۰۰۰۸
 کلچرل اکیڈمی، رینہ ہاؤس، جگ جیون لڈو، گیا
 شب خون کتاب گھر، ۳۱۳ دانی منڈی، الہ آباد

صد ہزار قصے

دفتر کے لئے بھاگتا ہوا نکلا تھا۔ سڑک پر بھی میری رفتار کافی تیز تھی، ٹیکسی میدان میں پہنچ کر میں خاصا سست رفتار ہو گیا۔ ہر روز یہی ہوتا ہے۔

وراصل میدان میں پہنچنے ہی دفتر دکھائی دینے لگتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ بس ایک ہی جست میں دفتر کے اندر ہوں گا۔ ابھی تو پورے پانچ منٹ باقی ہیں۔

آج میں آہستہ آہستہ میدان کی روش پر چل رہا تھا۔ ایسے وقتوں میں میں سوچتا ہوں دفتر میری نگاہوں کے دائرے میں ہے اور وقت میری گرفت میں — مکمل اطمینان اور آسودگی کا احساس —

جب بھی ان لمحوں کا سامنا ہوتا ہے تو آدمی بڑا فلسفی ہو جاتا ہے اور بہت کچھ سوچنے لگتا ہے۔

کنارے کھڑے ہوئے درختوں کی چھاؤں — اُس سے پرے جا بجا کچھ ہوئی چنچیں کہ جن کے نیچے مونگ پھلی کے چھلکوں اور چاٹ کے پتوں کا ڈھیر ہے۔ کنارے پھولوں کی کیاریاں — اس دنیا کی اندرونی پرت تو ہمیشہ سے سست رفتار خیالوں کے قبضے میں رہی ہے۔

میرے قدم دھیرے دھیرے بڑھ رہے ہیں۔ گھر کے قحقے دفتر کے دوستوں کے اور پھر اس دنیا کے۔

تب ہی اچانک میری نظر روپے کے ایک سکہ پر پڑی جو روش کے کنارے میدان میں پڑا تھا۔ میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا کہ وہاں کوئی ہے تو نہیں مجھے یہ محسوس ہوا کہ اگر نزدیک یا دور کچھ لوگ ہیں بھی تو وہ اس دماغ پر منظر سے قطعی بے تعلق ہیں۔ یہ سوچ کر میں نے چپکے سے اس چپکے ہوئے شاہزادے کو اپنی جیب میں بسالیا۔

چند قدم چل کر میں نے گھڑی دیکھی۔ دفتر کو تین منٹ اور تھے۔ ابھی وقت سب سے۔ میں نے جیب سے وہ روپیہ نکالا اور وہیں کنارے کی سیڑج پر بیٹھ گیا۔ روپے کو میں نے ذرا غور سے دیکھا تو اس کی چمک کم ہوتی دکھائی دی۔ وہ خاصا جھڈا بھی تھا، اور جب میں نے اسے سینٹ کے بیچ پر بجایا تو وہ چاروں ہاتھ پاؤں سینٹ کر دھپ سے بیٹھ گیا۔ خدا کے لئے مجھے نہ چھیڑو۔ مجھے کچھ شبہ نہ ہوا، کچھ تو ناچتا گاتا، تالیاں بجا کر شور مچاتا۔ یہ تو ایک کریمہ آواز نکال کر بیٹھ گیا۔

گھڑی کہہ رہی تھی۔ ”صرف ڈیڑھ منٹ اور۔ غور و فکر کا یہ دفتر بھی دفتر ہی میں کھولنا۔“ دفتر پہنچ کر میں نے اپنی جیب کی تلاشی لی تو معلوم ہوا کہ اس ایک سکہ کے علاوہ دو ایک نوٹ تھے اور کچھ ریڑ گاڑیاں تھیں۔ ایک روپے کا کوئی دوسرا سکہ میری جیب میں نہیں تھا کہ میں اس سے اس نئے سکہ کی صورت ملاتا۔ تب میں نے سنگھ، پرشاد، دریا اور رفیق احمد سے حدیث کیا کہ کیا ان کے پاس کوئی ایک روپے کا سکہ ہے؟

آخر شرما کے پاس ایک روپے کا سکہ مل گیا۔ میں نے ہر طور پر اس سکہ کو شرما کے سکہ سے ملایا، لیکن اس میں شرما کے سکہ جیسی تڑپ، چمک دمک اور گھن گرج نہیں تھی۔ میرے دل نے سوال کیا۔ ”آخر یہ سکہ ہے کیا؟“

دوستوں نے کہا:

”کسی نہ کسی طرح تو چل ہی جائے گا۔ کسی نے پھنسیا نہیں؟“

”کہیں بھیر بھار میں چلا دینا۔“

”سینا کے ٹکٹ گھریا بس میں چلا دینا۔“

”گویا اس میں خود چلنے کی طاقت نہیں ہے، وہ دھکے دے کر چلا جائے گا۔“
 کمار اینڈ کمار جنرل اسٹورس سے اگر کپڑے دھوئے ولے صابن کی ایک بیٹی لی جائے تو
 اس سکے کے ساتھ دس پیسے اور بھی دیئے ہوں گے۔ لیکن اگر یہ سکہ پہچان لیا گیا تو پھر مجھے نوٹ لینا
 ہوگا، اور صابن کی ایک نئی بیٹی میں برسوں ہی خرید چکا ہوں، اگر یہ سکہ چل جائے تو ایک فاضل بیٹی
 میں کوئی حرج نہیں لیکن اگر — بات یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس دو بیٹیاں ہو جاتی ہیں تو آپ
 پہلی کے استعمال میں وہ احتیاط نہیں برتتے جو دوسری کے نہیں ہونے پر برتتے ہیں۔
 دراصل ہم لوگ ایک چھوٹے سے دائرے کے لوگ ہیں، ساری زندگی ہم لوگ اسی فن کی
 مشق کرتے رہتے ہیں کہ ہمارے قدم اس دائرے سے باہر نہ نکلیں۔
 لیکن میری جیب میں جو دو ایک نوٹ پڑے ہیں، ان کی طاقت پر یہ سکہ چل سکتا ہے، یعنی یہ
 کہ اگر نہ چلا تو پھر میں نوٹ بڑھا دوں گا۔

کسی فائدے کے لئے خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا ہے۔

سینما کا ایک روپیہ پندرہ پیسے والا کاڈنٹر یاد آگیا۔ یہ ایک مصروف ترین کاڈنٹر ہوتا ہے،
 جس کے آگے دوڑنگ بل کھاتی ہوئی قطار ہوتی ہے، اور وہ تیزی سے اُسے چھوٹا کرتا جاتا ہے —
 لیکن اس کاڈنٹر پر دو افراد ہوتے ہیں، ایک نوٹ لیتا ہے اور دوسرا نوٹوں اور سکوں کی جانچ پڑتال کرتا
 جاتا ہے۔ اگر اس نے میرا سکہ بجا کر دیکھ لیا تو پھر کیا ہوگا؟ — پھر وہی میرا نوٹ کام آئے گا۔
 تب ہی ساری کچڑیں میرے سامنے آگئیں، جن کے متعلق میں نے تبصرے پڑے تھے، اور جن کے
 متعلق میں نے دوستوں سے بہت کچھ سن رکھا تھا — کچھ کچڑوں میں گھوڑے دوڑتے تھے، کچھ میں کاریں
 دوڑتی تھیں، اور کچھ میں آدمی دوڑتے تھے — اس بھاگ دوڑ سے بھاگ کر جاؤ تو پھر وہی بھاگ دوڑ۔
 یوں یہ ایک روپیہ کا سکہ چل جائے تو بھاگ دوڑ بھی گوارا، ورنہ میرا نوٹ ہر حال میں
 قیمتی ہے۔

’چاٹ ہاؤس‘ میں بڑی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے، لیکن اگر نہ چلا اور میری جیب سے نوٹ نکل گیا
 تو اتنی ہنگامی چاٹ پیٹ میں جا کر حشر بجا کر دے گی۔ نوٹ ہاتھ پر خولنے والے کی چاٹ لو تو ایک لپٹے

کی چاٹ خامی ہو جاتی ہے، مگر 'چاٹ باؤس' میں تو —

ایک روپے کا سکہ میری قبض کی جیب میں پڑا تھا۔ میز پر ٹالیں تھیں۔ اور سامنے
ایک سوائیہ نشان دیر سے کھڑا بسور ہا تھا۔ کیا کیا جائے اس سکے کا؟ —
کسی اسٹور میں چلانے جاؤ، تو وہ پہچان لینے پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ بکھیرتے
ہوئے کہے گا۔

”بابو جی ذرا اسے بدل دیجئے۔“

اور اس کی ایک مسکراہٹ کتنے ہی ققتوں کو اپنے داس میں چھپائے بیٹھی ہوگی۔

”بابو جی یہ سب ہم ہی سے کرنا تھا۔“

”بابو جی آپ بھی دیسے ہی نکلے۔“

پھر 'یہ سب' کے بھی کتنے رُخ تھے، اور 'دیسے ہی' کے بھی کتنے پہلو تھے۔

دیسے وہ یہ بھی تو سوچ سکتے ہیں کہ میں نے بھی کسی سے دھوکہ کھایا ہوگا، مگر لوگوں نے اب
اس ڈھنگ سے سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔

اگر میری انگلی کٹ جلنے سے چند قطرے خون کے میرے دامن پر گر جاتے ہیں، تو لوگ یہی
سمجھیں گے کہ میں نے کسی پر چاقو چلایا ہوگا، تب ہی میری انگلی زخمی ہوئی اور دامن پر خون کے دوہتے
بھی پڑے۔

ہر شخص یہ سمجھے گا کہ خود میں نے ہی اس سکے کو ڈھالا ہے۔

یہ سوچ کر میرے دل میں خوف کی ایک لہری دوڑ گئی۔ آخر میں نے اس بے جان سکے
کو میدان سے اٹھایا ہی کیوں؟ —

کتنے ہی ہاتھوں سے گذر کر یہ سکہ مجھے تنک پہنچا ہوگا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہ شخص جس نے
اسے ایک بند کھانی بنا کر میدان میں پھینک دیا تھا، مجھ سے کہہ رہا ہے۔

”یہ ایک ایسی دولت ہے جو تردد و دات کی فصل اُگاتی ہے۔ کچھ ہی سوچ کر میں نے اسے
خاک کے سپرد کر دیا تھا۔“

پر یہ کہ اسی ایک سکتے میں دو مجہول ساتھ، اور جو تالیاں بجانا اور ناچنا گانا نہیں جانتا تھا) یہ صفت تھی کہ اگر وہ چل گیا تو منفعتوں کی ایک چوٹی سی نہرت بنائی جاسکتی ہے جن پر میں نے کچھ غور بھی کیا ہے، اور ابھی بہت کچھ غور کرنا باقی بھی ہے۔

بچوں کے لئے مونگ پھلی۔ بھنے ہوئے چنے۔ کھلی گندیریاں۔

جب تک میرے پاس نوٹ ہے یہ سکھ کر ضرور نہیں ہو سکتا۔

سکے کا نکل جانا ہر حال میں ناممکن کا سودا تھا، لیکن اس کے چکر میں نوٹ کا نکل جانا گھٹائے کا۔

یہ خواہنے والے کسی کا بھی خیال نہیں کرتے۔ میری یہ سفید پوشی آنکھ جھپکتے ہی خاک میں مل سکتی ہے۔ اسی دن کی بات ہے اس غریب بالو کا گریبان تمام لیا تھا۔ شاید نوٹ پھٹا تھا، یا پیسے کچھ کم دے رہا تھا۔

اچانک ایسا محسوس ہوا کہ وہ سکتے میرے ہاتھ سے کامیابی کے ساتھ دوسرے ہاتھ میں چلا گیا۔ ————— 'کمار اینڈ کمپریز اسٹورس' کا کانٹر — کسی سینما کا ٹکٹ گھر — کوئی 'چاٹ ہاؤس' — کوئی خواہنے والا — کوئی ریڑھی والا —

لیکن دوسری ہی ساعت ایک مفلس و نادار میرے سامنے آکر کہتا ہے۔

”خدا تمہاری سات پشتوں سے سمجھے۔“ میرے اندر کے دونوں دیاؤں میں سخت طوفان آیا ہوا تھا۔

سارے دن ایک بڑے دفتر میں ایک چھوٹا سا دفتر کھلا رہا۔

’دفتر سے واپسی میں، دوستوں کے ساتھ چلتے ہوئے بھی میں اکیلا تھا۔

میرے حصے میں صابن کی ایک نئی جٹی آسکتی تھی — سینما کا ایک ٹو — ’چاٹ ہاؤس‘

میں میری پسندیدہ مٹر کی چاٹ —

لیکن پھر سارے منصوبے اسی گھرے دیا میں غرق ہو جاتے۔

وہ ہر بات میں پہنچ کر ایک مسئلہ بنے گا — اور ہر بات سے نکلنے کے بعد اپنے پیچھے فح و

نفرت کی ایک داستان چھوڑ جائے گا۔
تو اسے ہی فتح و نفرت کہتے ہیں۔

دین محمد کے درکشاپ کے سامنے پہنچ کر اچانک میرے قدم تھم گئے۔
”تم صاحب ذرا وہ لوہا کاٹنے والی قینچی دینا“
گھر آکر میں نے اس سکے کو کاٹ کر دو کر دیا۔
اب میرے بچوں کے ہاتھ میں کٹے ہوئے دو چاند تھے اور وہ خوش تھے کہ انہیں کیلئے کو
ایک چمکتی شے مل گئی۔

۱۹۷۷ء



دشت بہ دشت کوبہ کو

فقیر نے اپنی بھولی سے بھٹا ہوا بوجہ نکالا اور اسے سیلے ہوئے ٹوٹے پھوٹے فرش پر بچھا کر خرتہ سمیٹتے ہوئے بیٹھ رہا۔

باہر اُجالے اپنی اقلیم اندھیرے کے پردہ کر کے کوچ کی تیاریاں کر رہے تھے، اور وہ شور جو سناٹے کے سینے سے ابھرتا ہے اور جسے اندھیرے کے جھینگڑ کچھ اور تیز کر دیتے ہیں، بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا۔

فقیر زیر لب بُدبُدا یا۔ ”اندھیرا چھا رہا ہے۔“ اور یوں اس پر تسخیر پانے کے لئے اس نے موی شمع نکال کر روشن کر دی۔

اب جو مناظر اُس کی نظروں کے احاطے میں تھے وہ کچھ یوں تھے۔ اوپر نیچے اور سامنے، ہر طرف جالے، درار میں پڑی ہوئی دیواریں کہ جن کے پلاسٹر جگہ جگہ سے اکھڑے ہوئے تھے۔ سیلن کے سبب ہر طرف کافی کی دبیز تہیں۔ چھت کے سینے میں پیوست کسی پودے کی جڑیں۔ بغیر سوازے کا ایک حُجّہ اور سامنے چیخا ہوا اندھیرا۔

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ فقیر کسی کی راہ دیکھ رہا ہے۔

تب ہی دور کہیں ایک پتہ کھڑکا تو فقیر نے نظر اٹھائی۔ پھر بار بار شاخیں جھنجھٹائیں، زمین پر بڑے خشک پتوں نے آہیں بلند کیں اور یہ شور قریب سے قریب مڑتا گیا۔

فقیر اگلی ساعتوں سے قطعی بے فکر تھا۔ لگتا تھا اسے اپنے ہی جیسے کسی ذی نفس کا انتہا ہو تب ہی ایک شخص روشنی کے دائرے میں نمودار ہوا۔ لاجبی سی قبایز تب تک بغل میں ایک بھولی دبائے۔

اس نے آتے ہی ایک زوردار سلام کیا، اور مصلحے اور معافتے کے بعد بورے پر بیٹھ گیا۔

”دور سے مجھے یہ روشنی نظر آئی اور میں اسی سمت چل پڑا۔“

”اسی سبب سے میں نے یہ شیخ جلائی تھی کہ کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ اس کا سراغ لگاتا ہوا یہاں پہنچ جائے گا۔“

جب وہ بولتے تو ان کی آوازیں جھنگل کے شور کو کچل کر رکھ دیتیں۔

”اس بورے میں ابھی اور دست ہے۔“

پھر وہ اپنے من کی دنیا میں کھو گئے، اس طور پر جیسے انہیں اس بات کا کامل یقین ہو کہ ان کی وضع قطع کے کچھ لوگ اور بھی آئیں گے، تب سب مل کر تن کی دنیا کے دھماکے کو لیں گے، فی الوقت تو صرف وہی دو ہیں۔

پھر ایک بار پتے کھڑکھڑائے اور انہیں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ سناٹے نے ان کی سماعت کو بے حد تیز کر دیا تھا، وہ آواز نزدیک ہوتی گئی، حتیٰ کہ روشنی کے احاطے سے اک ذرا پرے انہیں ایک انسانی صورت نظر آئی۔

وہ شخص بھی اسی قلندر کی شان کے ساتھ وارد ہوا، اور علیک سلیک اور مصلحے و معافتے کے بعد وہ بھی فرش پر اپنی بھولی رکھ کر بورے پر بیٹھ رہا۔

”روشنی دیکھ کر اس جانب چلا آیا۔“

”تم نے بہت خوب کیا۔“

بورے میں اب بھی وسعت تھی۔

تب ہی ایک چوتھا فرد بھی روشنی کا پتہ لگاتے ہوئے وہاں پہنچا اور سلام و کلام کے بعد اس نے بھی بورے میں اپنی جگہ بنالی۔

اس روشنی میں سبھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا وہ سب خاموش نظروں سے بس ایک ہی سوال کر رہے تھے۔

”اب کیا کیا جائے؟“ — ”یہ آپس کا مل بیٹھنا بے حد غنیمت ہے۔ یہ لمحے بڑے قیمتی ہیں انہیں یوں نہ گنویا جائے۔“

پہلے فقیر نے ایک ٹھنڈی آٹھ بھر کر کہا۔ ”اللہ بس باقی ہوں۔“ یہی ہمارے تجربوں کا بخور ہے۔ دوسرے نے کہا۔ ”فقیر کا علم تو یہ کہتا ہے کہ جگ میں رہ کر جگ سے دور خود میں رہ کر خود سے دور۔“

تیسرے نے کہا۔ ”چلتے چلتے میرے پاؤں شلی ہو گئے، مگر منزل کہیں نہیں ملی۔“

چوتھا بولا۔ ”سب کہانیاں ہی کہانیاں ہیں، حقیقت بس ایک ہی ہے۔“

اس پر ”حق ہے حق ہے“ کی صدائیں گونج اٹھیں۔

اور تب پہلے فقیر نے ایک نمرؤستانہ بلند کیا۔ ”اللہ بس باقی ہوں۔“

وہ چونکہ سب سے پہلے آیا تھا، اور اس غربت کی تقریب کا وہی محرک تھا، اس نے ہر سکوت کو گویائی کی جانب سے ملتی تھی۔

”مجاہدات ایک پہر گزر چکی ہے، فقر کی جھولی میں کچھ سوکھی روٹیاں اور دو لیک بوٹیاں دھجکی ہیں۔“ اُدبسم اللہ کرو۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی جھولی میں ہاتھ ڈالا اور ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی کچھ روٹیاں لہر بوٹیاں ان کے سامنے پیش کر دیں۔ اس پر سبھوں نے اپنی اپنی جھولیوں سے اپنے حصے کی روٹیاں، ساگ، سبزیاں اور آلو کے قتلے نکال کر درمیان میں رکھ دئے اور حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔

دیر تک وہ کھانے کے ساتھ انصاف کرتے رہے، اور جب سب کچھ ختم ہو گیا تو ان کپڑوں کو جن میں روٹیاں بندھی تھیں، جھاڑ کر اپنی جھولیوں میں رکھ لیا اور تب اپنی اپنی چھال سے خوب میسر ہو کر

پانی پیا۔

”کل کی نکر فقیروں کا شیوہ نہیں۔“

”حق ہے۔“

”حق ہے۔“

ان میں سے ایک نے اپنی جھولی سے ایک چھوٹا سا حقہ اور چلم برآمد کی، اور تب اس پر تب کو ڈال کر اور کوٹے جاکر اسے آگ دکھا دی۔ دوسرے نے اپنی جھولی سے خشک تبنا کو نکالا اور چونے کے ساتھ اپنی ہتھیلی پر دیز تک رگڑتا رہا، اور بالآخر اسے چٹکی چٹکی بھر چاندیوں کو دے دیا، جسے انہوں نے دانست کے نچلے حصے میں دبا لیا۔ اسی اثنا میں حقہ بھی تیار ہو گیا۔ حقے والے فقیر نے دو چار کش کھینچ کر حقہ آگے بڑھادیا، اور وہ ان کے درمیان گشت کرتا رہا۔

ان میں سے ایک نے کہا: ”اگر تم اجازت دو تو میں کچھ سناؤں۔“

’ضرور ضرور‘ سمجھوں نے بیک زبان کہا۔

تب اس نے ایک گیت چھیڑ دیا۔

ہر گام پر رک کر میں نے ایک ایک سے پوچھا۔

منزل کہاں ہے؟

کوئی نہیں بتاتا۔

منزل کہیں نہیں ملی،

لیکن ہم اس کی تلاش جاری رکھیں گے،

جب تک ہمارے جسم و جاں سلامت ہیں،

اور ہمارے چراغ میں روغن باقی ہے۔

وہ سب آبدیدہ ہو گئے۔

اندر روشنی کے گھیرے میں ایک حجرہ تھا، جس میں گہری سیلن تھی اور ہر طرف جالے تنے بٹھے۔ کائی لگی دیواریں جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھیں اور ان کے پلاسٹر اکھڑ گئے تھے اور چھت پر جانوروں کے

بیت

نیر اور میمونہ کے نام
 تنہا راہ میں میری دعا کے پھول کھلیں،



**THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM**

**LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.**

درمیان کسی پودے کی پتی پتی جڑیں تیزی سے اپنے قدم جباری بٹھیں۔

باہر سناٹے کا بھیانک شور، جھینگروں کی دل دوز صدائیں اور وقفے وقفے پر پتوں کی جھنجھاہٹ سناؤ دیتی تھی۔

اب نیند سے ان کے چوٹے بھاری ہو چکے تھے۔

”آؤ اب لیٹ رہیں۔ اگر کل کا سورج دیکھنا نصیب ہوا، تو پھر سوچیں گے کہ کس سمت کو چلا جائے کہ کل کی فکر ہم فقیروں کا خیوہ نہیں۔“

اور تب وہ ٹانگیں پھیلا کر اور اس بات سے قطعی بے نیاز ہو کر وہاں کسی وقت بھی سانپ بچھو نکل سکتے ہیں، اور کسی وقت بھی درندے آسکتے ہیں، اس ٹوٹے پھوٹے تجربے کے سیلن زدہ فرش پر لیٹ رہے۔

کچھ ہی دیر بعد ان کے خزانے، سناٹے کے شور سے کہیں آگے نکل چکے تھے۔

جلوس

اب وہ گلی میں دھیرے دھیرے قدموں سے چل رہا ہے، اس طرح جیسے عام حالات میں چلا کرتے ہیں، سستی پر تبا کو ملتے ہوئے۔

ایک دس کے نوٹ کی سلائی سی بنا کر اُس نے اپنے ایک کان کے اوپر اُس لی ہے۔ اسے اس عالم میں دیکھ کر رکوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں مختلف مکانات اور گلی کوچوں سے نکل کر اس کے پیچھے لگ گئی ہیں۔ وہ سب شور مچا رہے ہیں، بے ہنگم صدائیں بلند کر رہے ہیں، تالیاں بجا رہے ہیں اور گالیاں دیتے جا رہے ہیں۔

بڑی عمر کے لوگ اس کی راہ سے ہٹ کر کنارے ہو گئے ہیں۔

”کل تک تو بھلا چہنگا تھا“

”تم کل کی بات کر رہے ہو، میں نے ابھی ابھی دیکھا تھا۔“

لیکن وہ شخص ان ساری باتوں سے بے نیاز، تبا کو مسلتا ہوا چلا جا رہا ہے، اُس کے آگے گلی ہے، نین لگتا ہے گلی کے جلووں کے علاوہ بھی بہت سارے جلوے اس کی نظروں میں بسے ہیں۔

دونوں رُخ پر دوکانیں ہیں، لیکن اس کی آنکھوں کے بھرے بھرے جلوؤں کے درمیان، ان سامنے کے جلوؤں کی کوئی رسائی نہیں ہے۔ پھر بھی جب رکشا گزرتا ہے تو وہ کنارے موجتا ہے اور جب کار کی ہیڈلائٹ نظر آتی ہے تو اس کی نگاہیں قدموں کے نیچے مرکوز ہو جاتی ہیں۔

اس کے پیچھے لمبوں کا ایک بھجوم ہے۔ یہ وہ لڑکے ہیں جنہوں نے کبھی بھی کسی آشفٹہ حال کو بخشا نہیں ہے۔ بھجوم تالیاں بجاتا ہوا، داہی تباہی بکتا ہوا، کچھ ہاتھوں سے اشارہ کرتا ہوا، کسی کسی موقع پر اس کے آگے بھی آ جاتا ہے، لیکن وہ بے حد صلح پسندانہ انداز میں اسے ایک طرف ہٹا دیتا ہے۔

یعنی یہ کہ وہ کہیں رکتا نہیں ہے۔

اُس کے جسم پر۔

بس یوں سمجھئے کہ کان میں اُس نے دس کے نوٹ کی ایک سلائی بنا کر اُس لی ہے اور آنکھوں میں اتنے سارے مناظر بٹائے ہیں کہ ان کے بوجھ تلے سامنے کے مناظر دب سے گئے ہیں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔

چند ایک احباب جو ہر شام لگی کے ایک خاص پوائنٹ پر ملتے ہیں اور مقامی اور بیرونی ریاست، حالات حاضرہ، کھیل کود اور فلم پر تبادلہ خیال کیا کرتے ہیں، اُسے دیکھ کر چونک سے جاتے ہیں۔

اور وہ ہے کہ اُس کے کان میں دس کے نوٹ کی ایک سلائی پھنسی ہوئی ہے اور بس اس کے علاوہ اس کے جسم پر دنیا نام کی کوئی شے نہیں ہے۔

”نیا نیا انقلابی نظر آتا ہے۔“

”ہر طرف جنگل ہی جنگل بے ہیں۔“

”طبی اصول سے یہ طریقہ صحیح ہے۔“

لیکن وہ کسی بات کا نوٹس نہیں لیتا ہے، لگتا ہے اگر اس نے ذرا بھی ادھر توجہ دی تو سارا کیا دھرا خاک میں مل جائے گا۔ بس وہ ہے اور اس کا تبا کو جسے وہ حقیلی پر سلتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی چال میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی دکھائی نہیں دیتی اور صاف صاف یہ محسوس ہوتا ہے کہ

یہ شخص زندگی بھر اسی چال سے چلتا رہا ہے۔ نہ کئی نمایاں تیزی نہ کوئی نمایاں سستی۔

لوگ دوکانوں سے سر نکال کر اسے دیکھتے ہیں، اور پھر کوئی فقرہ چُست کر کے سر اندر دیکھتے ہیں۔
”دیوانہ نہ بھی ہو تو یہ دیوانگی ہے۔“

ہر دو چار قدم پر لڑکوں کی ایک نئی ٹولی ہجوم سے آلتی ہے۔

کچھ لڑکے جھیر چھاڑ سے یوں گریز کر رہے ہیں کہ ابھی نیا نیا ہے۔ کچھ لڑکے معاملے کی تہ تک پہنچ چکے ہیں، اور یوں اس منظر کے عروج و زوال سے دلچسپی رکھنے کے سبب تماشہ میں بے ہجوم کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔

ہجوم کی ایک ٹولی اگر بلی کی میاؤں میاؤں کرتی ہے تو دوسری کتنے کے بھونکنے کی صدائیں بلند کرتی ہے۔

لیکن وہ شخص ان باتوں سے قطعی بے پرواہ سا ہے۔ اس کی آنکھیں لگی ہیں ہونے کے باوجود گلی سے دور ہیں اور اس کے کان لگی ہیں ہونے کے بعد بھی گلی سے کالے کوسوں دور دکھائی دیتے ہیں۔

اب وہ سڑک کے قریب آگیا ہے۔ سڑک پر چونکہ دو طرفہ سوار یوں کا رواج ہے، اس لئے بسوں، اسکوٹروں اور کشتوں کا سلسلہ کسی طرح ٹوٹتا ہی نہیں ہے۔ ایک طرف سے اگر گاڑیوں کا سلسلہ رک سا جاتا ہے تو دوسری طرف سے سوار یوں کی یورش شروع ہو جاتی ہے۔ سڑک پر روشنی کا سیلاب ہے اس سیلاب میں بہتے بہتے لوگ اس کے قریب آتے ہیں اور پھر دور جا کھڑے ہوتے ہیں۔

چلتے چلتے کسی نے کہا۔ ”کوئی اللہ کا بندہ اس پر کرم کرتا۔“
اس پر ہجوم نے ایک زبردست فقرہ بلند کیا۔

لیکن اس نے تو جیسے ہجوم میں تنہا رہنے کا فن سیکھ لیا ہے۔ اسے اپنے اوپر پورا اعتماد ہے۔ لگتا ہے وہ جو کچھ بھی کرے گا اپنے ارادے سے کرے گا، دوسرے کسی کا شور مٹانے کو وہ قطعی تیار نہیں ہے۔

جب بھی گاڑیوں کا تانتا کچھ مُست پڑ جاتا ہے تو لڑکے ایک ساتھ خور مچاتے ہیں۔
”پارک جا استاد۔“

لیکن وہ دونوں جانب اس طرح دیکھ رہا ہے، جیسے وہ خود اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ اسے کب سڑک پار کرنی چاہئے۔

تب ہی بھاری گاڑیوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور سڑک پر صرف رکشے اور سائیکلیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ وہ بڑے اطمینان سے اس پندرہ بیس فیٹ چوڑی سڑک کو پار کر کے دوسری طرف چلا جاتا ہے۔

ادھر بھی ہر موٹر پر اسے حیرت و استعجاب میں ڈوبے لوگ ملتے ہیں۔ لیکن وہ تو پتھر کی آنکھیں اور پتھر کے جسم و جاں لے کر چلا ہے۔ غیروں کے پھینکے ہوئے تاثرات اور غیروں کے پھینکے ہوئے حملوں کا اس پر کوئی رد عمل نہیں ہوتا۔

وہ ایک ایسا عمل ہے جو کسی بھی رد عمل سے مبرا ہے۔

سڑک پار کر کے وہ اس منڈی میں داخل ہو جاتا ہے جس کے اگلے سرے پر پھل کی دوکانیں ملتی ہیں اور نسا آگے غلے کی دوکانیں۔

اگر اس کے پیچھے لڑکوں کا ہجوم نہ ہوتا تو شاید یہ منظر لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے میں ناکام رہتا، لیکن لڑکے غلے کے بڑھتے ہی جا رہے تھے امدان کی علی علی آوازوں نے ایک خوفناک سماں باندھ دیا تھا، لگتا تھا ادھر سے کوئی غزل بیا بانی گذر رہا ہے۔

پھل کی دوکانوں سے گاہک اسے پلٹ پلٹ کر دیکھنے لگے تو دوکانداروں کو یہ ڈر لگا کہ کہیں گاہک آگے نہ بڑھ جائیں، تب ہی انہوں نے اپنے گاہکوں کو کہا۔ ”چھوڑیے کیا دیکھ رہے ہیں، شہر ہے تو دیوانے بہت“

پر یہ کہ اس کی سماعت اور اس کی بصارت جو قریب ہوتے ہوئے بھی درحقی اس سے یہی کہتی تھی کہ بس آگے بڑھے چلو۔

پھل کی دوکانیں ختم ہوئیں تو غلے کی دوکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

دو چار دوکانیں ملے کر کے وہ ایک دوکان پر رک گیا۔

بننے نے ہجوم کو دیکھ کر کہا۔ ”نیچے ہی رہو بھئی نیچے ہی رہو۔“

پھر وہ سارے گاہکوں کو چھوڑ کر خود ہی اس کے پاس آگیا۔
 ”کل تک تو اچھے تھے۔“

اس نے چاول کا بھاد پوچھا۔ اور پھر تبا کو کے سفوف کو دانتوں میں دباکر کان کے اوپر پھنسی دس کے نوٹ کی سلائی دیتے ہوئے بنے سے کہا۔ ”سب کے چاول دے دو۔“
 دوکاندار نے کاغذ کے بڑے سے قسطے میں چاول باندھ کر دیا اور کہا۔ ”اب گھر جاؤ۔“ جیسے وہ اپنے کسی عزیز کو یہ مشورہ دے رہا ہو۔

لڑکوں نے شور مچایا ”جیت گیا بھی جیت گیا۔“

واپسی کے سفر میں اس کے چہرے پر کچھ تاثرات آگئے تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ اس نے ایک مرحلہ سر کر لیا ہے۔
 اگلے موڑ پر دوستوں میں گفتگو ہو رہی تھی۔

”اچھا تم نے اب دیکھا۔“ ”خاصا بھلا چھٹکا تھا جانے کیا چکر ہے۔“

”میرے سامنے کی بات ہے۔ ڈھلے دالے سے اس کی بحث ہو رہی تھی۔ ممکن اور ناممکن۔ تب ہی اس نے کہا دکھاؤ دس کی پتی.....“
 سڑک پار کرنے میں اسے حسب معمول کچھ دیر لگی۔
 آتے جانے والوں کی نظریں اس پر گر جاتیں۔
 ”اے کیا غم ہے۔“

”کوئی تو اس سے پوچھے۔“

جب وہ اپنی گلی میں داخل ہو گیا تو لڑکوں نے زوردار نعرہ لگایا۔

”جیت گیا بھی جیت گیا۔“

کسی نے کہا ”نعرے تو یوں لگا ہے میں جیسے کوئی سدا جا رہا ہے۔“

وہی لڑکے جواب تک کتے اور بیویوں کی آوازیں بلند کر رہے تھے۔ گالیاں بک رہے تھے اور شور مچا رہے تھے، اب تحمین آئینہ نعرے لگا رہے تھے۔

تب ہی ایک لڑکے نے "غزوہ ہند کیا"۔ نگلا بابا جیت گیا۔
 دوکانداروں نے اسے واپس جاتے دیکھا تو کہا: "اچھا اچھا یہ معاملہ تھا۔"
 کسی شخص نے وہیں کے وہیں ایک چار آنے کا ہار خرید کر اس کے گلے میں ڈال دیا۔ اُس نے
 اشارے سے اس کا شکریہ ادا کیا، اس کے ہاتھ میں چاول کا تھیلہ جو تھا۔
 ڈھلے میں پہنچ کر اس نے آواز لگائی۔
 "لو خاں صاحب میں آ گیا۔"
 ڈھلے والے نے کہا۔ "مان گیا استاد تم بڑے جی دار نکلی۔"
 وہ نیکر اور تہ بند لے کر ڈھلے کے پیچھے والی کوٹھریاں چلا گیا وہاں سے واپس آ کر اس نے
 اطمینان کی ایک بھرپور سانس لی جیسے وہ آبادیوں میں واپس آ گیا ہو۔
 تب ایک ایک کر کے بچے اپنے گھر کو روانہ ہو گئے۔

یہی آدمی یہی آدمی

پوڑھے بن مانس اور اس کے کہنے کو دیکھ کر گڈو بے حد خوش ہوا تھا۔

’پاپا اس کے جسم پر اتنے بال کیوں ہیں؟‘

’یہ ٹاٹ کو کیوں لویج رہا ہے؟‘

’یہ ٹائر اس رسی میں کیوں بھول رہا ہے؟‘

گڈو نے اس طرح کے درجنوں سوال پہلے بھی کئے تھے۔ اس کی خوشی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آج ہم نے ایک عرصے بعد اس کی چڑیا خانہ دیکھنے کی خواہش پوری کی تھی۔ چنانچہ بعض جانوروں کے سامنے پہنچ کر تقاس نے خوشی سے بے قابو ہو کر اپنے گلے سے عجیب عجیب آوازیں نکالی تھیں۔

ہم ہر قسم کے بندر، خیر، جالو، چیتے اور گینڈے دیکھ چکے تھے۔ ان کے علاوہ ہم نے چند ایسے عظیم الجثہ جانوروں کے رسنٹ سے ڈھلے ڈھلپٹے بھی دیکھے تھے، جو کئی سو سال قبل مسیح معدوم ہو چکے تھے۔ معدوم شدہ جانوروں کے قاب کے سامنے پہنچ کر گڈو نے ایک ٹیڑھا سوال کر دیا تھا۔

’پاپا یہ ختم کیوں ہو گئے؟‘

اس کے بعد ہمارا ارادہ تھا کہ پلایا پارکر کے چڑیوں کے جال کی طرف چلیں گے کہ اتنے ہی میں ایک موڑ پر ہمیں ایک بورڈ نظر آیا۔ ”آدمی“

بورڈ پر ہاتھ کے اشارے سے راستے کی سمت بنی ہوئی تھی۔

”آدمی کا بورڈ دیکھ کر میں سخت حیرت مئی۔ گڈو بھی بار بار پوچھ رہا تھا کہ یہ کیا کسی اور طرح کا آدمی ہے۔“

ہم جواب کیا دیتے کہ ہم نے خود بھی اُسے نہیں دیکھا تھا۔

مورنگ کبھی پتلی سڑک پر کچھ دور جا کر ہمیں ”آدمی“ کی قیام گاہ مل گئی، اور جس طرح دوسرے مقامات پر بورڈ لگے تھے، اسی طرح ”آدمی“ کے یہاں بھی ایک بورڈ نصب تھا، جس میں اس کا مکمل تعارف ملتا تھا۔
— یہ ہزاروں سال پرانے آدمی کی نسل سے تعلق رکھتا ہے، اور آج بھی (اس کے آگے ہمد کی تحریک کو کسی نے کھریچ دیا تھا)۔

— یہ صرف گوشت کھاتا ہے۔

تب ہی ہم اس کٹہرے کے قریب پہنچ گئے جس کے نیچے ایک گہری کھائی تھی، اور جس سے کوئی اٹھارہ فیٹ کے فاصلے پر سڑک کی سطح کے برابر ایک بڑا سا زمین کا حصہ تھا، جس کا فرش پکا تھا۔ اس زمین پر دو تین چھوٹے چھوٹے کمرے نظر آئے، جن میں اوپر سے سلاخوں والے ددوانے گرے لگا کر بسٹ تھا۔

گڈو نے کہا۔ ”پاپا اسی طرح تو بن ماس اور شیر بھی رہتے ہیں۔“

آدمی کہیں نظر نہیں آیا، تو بچوں کے ایک گروہ نے جو دیر سے ہم لوگوں کے ساتھ گھوم رہا تھا، شور مچایا۔ ”آدمی کہاں ہے؟“

تب ہی ان کے اسکول کے ایک ماسٹر جو بے جودقتاً فوقتاً اسکول سے بچوں کی ٹولیاں لایا کرتے تھے، انہیں چپ کر لے تھے ہم نے کہا۔

”ابھی وہ کھانا کھا رہا ہے، خدا صبر کرو۔“

اتنے میں ایک آدمی ننگے بدن، گرد اور میل میں اٹا، کمرے سے برآمد ہوا۔ اس نے جسم کے

ترتیب

• بستی ایک نئی ہے	• اُن کی تجربہ گاہ
• رشتہ	• فرد
• آنے والا	• کل کی شب
• باب ایک گزرگاہ کا	• صد ہزار قصے
• کاروبار	• دشت بہ دشت کُبر کو
• حالات	• جلوس
• اُترتی چڑھتی رونقیں	• یہی آدمی یہی آدمی
• ۲۳ گھنٹے کا شہر	• مکالمہ
• مجلس	• صورتِ اک بے کیفی کی
• وقتِ رخصت	• قربت کی دُوری

پنچلے حصے کو کسی درخت کے بڑے بڑے پتوں سے ڈھانپ لیا تھا۔ اس کے بال کی ایسی جوتہ تھیں کہ گرد اور مٹی کے سبب رسیوں کی طرح بٹ گئی تھیں، اُس کی پیٹھ پر قبول رہی تھیں۔ دائرہ اس کی ناک تک پہنچی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں سرخ دھڑے تیر رہے تھے اور ناخن بے طرح بڑھے ہوئے تھے اس کے ہاتھ میں کسی جانور کی کھال اور مڑی ہوئی ٹانگ تھی، جسے وہ دانت سے نوچ نوچ کر کھا رہا تھا۔ اس کے بعد ایک عورت بھی کم و بیش اسی طے میں نکلی۔ اس کے ہاتھ میں بھی گوشت کا ایک ٹوٹھا تھا جسے وہ دانت سے کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھی۔

گڈو نے پوچھا۔ ”پاپا وہ پکا کے کیوں نہیں کھاتا؟“

اور پھر تو اس نے انگنت سوال کر ڈالے۔

_____ ”یہاں چڑیا خانے میں کیوں رہتا ہے؟“

_____ ”گندہ کیوں رہتا ہے؟“

_____ ”کپڑے کیوں نہیں پہنتا؟“

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ گڈو کے سوالوں کا صحیح جواب دینے سے میں کیسے ترنا صرتھا۔

اُدھر اسکول کے بچوں نے ماسٹر جی کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔

..... ”درخت اس لئے نہیں ہیں کہ آدمی کے اس جوڑے نے ایک بار درخت کو

جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی تھی۔“ ماسٹر جی بول رہے تھے۔

..... ”اس کے بعد وہ یہ بھی کر سکتے تھے کہ جہاں وہ ہیں وہاں سے اس کٹہرے تک،

کھائی کے اوپر درخت کا پل بنا لیتے اور آسانی سے اُدھر آ جاتے۔“

اچانک ماسٹر جی نے ایک زوردار ہانک لگائی۔ ”بچو سرجاؤ۔“ مردے پنچ ہوئی ٹانگ

کی بڑی ہم لوگوں کی طرف اُچھال دی تھی۔

اس پر بچے تو بچے، ہم بڑوں کو بھی سخت حیرت تھی کہ صبح سے دپہر ہونے کو آئی، کسی جگہ بھی

ہمارے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک نہیں کیا گیا۔

لیکن وہ تو ہم لوگوں کو دیکھ دیکھ کر خوفناک تہقہ بند کر رہا تھا۔

ماسٹر جی بتا رہے تھے..... "جس زمین پر یہ جوڑا بیٹھا ہے، پہلے وہاں پتھر بچھے تھے، لیکن جب ان لوگوں نے آئے ڈالوں پر پتھر برسائے شروع کر دئے تو منتظموں نے پوری زمین کی کراہی۔ اب وہ اس فرش کو توڑ نہیں سکتے۔"

گول قطعہ زمین کے چالوں طرف کنارے کنارے شیشے کے ٹکڑے لگے تھے۔
 "..... یہ اس لئے لگائے گئے کہ انہوں نے ذرا ایک بار نیچے اترنے کی کوشش کی تھی۔"

"..... کھائی کی دیواروں کا چکنا پلا سٹر دیکھتے ہو؟ — پہلے یہ دیواریں کچی تھیں، لیکن جب انہوں نے نیچے اترنے کی کوشش کی تو یہ دیواریں بھی کچی اور سطح کراہی اٹھیں۔"
 کھانے کے بعد وہ جوڑا کمرے میں چلا گیا۔

اسی اثنا، خاکی وردی میں بمبوس، چڑیا خانے کا ایک ملازم ادھر سے گنٹا تو ہمارے پوچھنے پر اس نے بتایا۔

"ان کے لئے اندر پانی کا حوض بنا ہوا ہے۔ یہ حوض میں منہ ڈال کر پانی پیتے ہیں۔"
 بچوں نے خاکی وردی والے کو اپنے گھرے میں لے لیا۔ ایسا واقف کار انہیں پھر کہاں ملتا۔
 "..... کپڑے ہمیشہ دئے جاتے ہیں، لیکن یہ انہیں پھاڑ کر پھینک دیئے ہیں۔"
 "..... بچے گوشت کو تو منہ نہیں لگاتے۔"

جب وہ جوڑا پانی پنی کر باہر نکلا تو اُس نے کچھ ایسی حرکتیں شروع کر دیں، جنہیں بچے تو پورے طور پر سمجھ نہیں پائے، لیکن بچوں کی موجودگی میں بڑوں کی آنکھیں جھک گئیں۔

تب ہی وہ جوڑا ہمارے قریب آگیا۔ مرد نے ہوا میں تیزی سے اپنے ہاتھ ہارائے اور کچھ ایسی دوہری تہری آوازیں اپنے حلق سے نکالیں جو "شش" اور "ف" سے ملتی جلتی تھیں۔
 پاس سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اسی کے سارے جسم پر بڑے بڑے کھرچے بنے تھے۔
 بچے دُور کر آپس میں گتھ گئے۔

ماسٹر جی نے کہا — "لگتا ہے وہ کہہ رہا ہے کہ تم لوگ بھاگ جاؤ، لیکن بچو ڈرنے کی ضرورت

نہیں وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

ہم اس کٹہرے سے ننگے کھڑے تھے جس کے نیچے ایک گہری کھائی تھی اور جس سے کوئی اٹھارہ فیٹ کے فاصلے پر زمین کا ایک قطعہ تھا جس کے پتے فرش پر وہ جوڑا بیٹھا تھا جو چرایا خانے کی فراہم شدہ اطلاع کے مطابق ایک ایسی انسانی نسل سے تعلق رکھتا تھا جو ہزاروں سال پہلے دنیا میں رہا کرتی تھی اور جو آج بھی.....

ہماری سرحد کٹہرے پر ختم ہو جاتی تھی۔ اس کی سرحد نو کیلے خشیشوں سے شروع ہوتی تھی اور ان دونوں سرحدوں کے درمیان ایک گہری کھائی تھی۔

ماسٹر جی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”تھوڑی عقل تو اور بھی مصیبت بن جاتی ہے۔“
گڈو نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا اس کا یہ انداز بتا رہا تھا کہ وہ بے حد خوفزدہ ہے۔
میں نے اس کی یہ حالت دیکھی تو کہا۔

”چلو بیٹے تمہیں سو رو دکھاتے ہیں۔“
لیکن گڈو نے خلاف توقع میری تجویز کو روک کر کہہ دیا۔
”نہیں پاپا اب گھر چلیں گے۔“

مکالمہ

ضعیف العرقہ گونے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

_____ ہاں تو جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا وہ چشمہ ہنستا کھلتا، خوشی کے شادیانے بجاتا آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

بسی جھگ کے ہاں اور اس کے کنارے بسی آبادی چشمے کا پانی پی کر تازہ دم ہو جایا کرتی۔ جہاں سے وہ چشمہ نکلا تھا وہاں سے کچھ دور آگے جا کر نیچے کی سطح پر بہا کرتا۔
ایک دن کا واقعہ ہے.....

اس تمہید کے بعد جب قصہ گو نے یہ جملہ جھیرا تو سننے والے ذرا اور محسّس آئے کہ گویا اب دریا میدانوں میں اُتر آیا ہے اور بات آگے بڑھے گی۔

_____ تو یہ ہوا کہ اس دن ادپر کی جانب ایک شیر چشمے کا پانی پی رہا تھا، جب وہ جی بھر کر پانی پی چکا تو اس نے اس پاس کے ماحول اور دور دور تک پھیلی ہوئی فضا کو اپنی آنکھوں میں بسایا۔ اس درمیان اس نے کئی نادرے اپنی گردن کے بدلے، کئی بار اپنی آنکھوں کو سمیٹا اور پھیلایا، اور تب ہی ایک

منظر اس کی آنکھوں کو ایک نئی چمک دے گیا۔

جہاں وہ شیر کھڑا تھا، اس سے کچھ فاصلے پر نشیب کی طرف ایک مینا چٹنے کا پانی پی رہا تھا۔
چٹنے کا حیات بخش پانی، دوردور تک پھیلی ہوئی فرحت بخش فضا اور اس پر سینے کی شکل
میں ایک لذیذ نعمت۔

دوسری ہی ساعت شیر کے دل میں ایک خیال آیا۔ وہ ماتحتوں سے بات چیت کے طور پر بقول
سے بخوبی واقف تھا۔ جو نمل اس کے لئے صحیح ہو سکتا ہے وہ اس کے ماتحتوں کے لئے غلط ہو سکتا ہے،
اور جو ان کے لئے صحیح ہو سکتا ہے وہ شیر کے لئے غلط ہو سکتا ہے۔ حکمرانی کے کچھ آداب تھے جو اس کے
خون میں رچ بس گئے تھے۔ تب ہی شیر نے مگر جتنے ہمنے کہا۔

”ابے چھو کو تیری یہ مجال کہ اس پانی کو گندہ کرے جسے میں پیتا ہوں۔ تو نے یہ نہیں دیکھا
کہ تجھے کچھ ہی دور پر ہیں بھی اس چٹنے کا پانی پی رہا تھا۔“

مینا کانپ اٹھا، اور اُس نے بڑی مشکلوں سے خود کو کیجا کر کے کہا۔

”حضرت سلامت! آپ اوپر ہیں اور میں نیچے ہوں، چٹنے کا بہادر اوپر سے نیچے کی طرف ہے
ایسے میں بھلا میں آپ کا پانی کس طرح گندہ کر سکتا ہوں۔“

سننے والوں میں سے کسی نے کہا۔ ”شیر اور مینے کی منسلک فرق واضح ہے۔“

اس پر قصہ گو نے کسی قدر ناخوشگوار ہجے میں ان سے کہا کہ وہ قصے کے درمیان کسی قسم کی
رائے زنی سے پرہیز کریں، ورنہ قصہ بھول جائے گا۔

————— ہاں تو بھر شیر کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اس کا چہرہ کچھ اور بڑا ہو گیا اور اس کا قد
کچھ اور کھینچ گیا۔

اور جب وہ زور سے دھاڑا تو ساری فضا تھرا اٹھی، لیکن دوسری ہی ساعت یہ محسوس ہوا کہ
فضا نے پناہ نام سادھ لیا ہے۔ یہی حال سینے کا بھی تھا۔

شیر نے کہا۔ ”ٹھہر تجھے تیری گستاخی کا مزہ چکھاتا ہوں۔ تجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ مجھ سے
اس جنگل کے کتنے پکھیر، چوہے بڑے جانور اور پیر پودے کس طرح بات کرتے ہیں۔“

یہ کہہ کر شیر نے نشیب کا رخ کیا۔ میمنے کی اتنی ہمت کہاں کہ فزا کی سوچے، پہلے ہی شیر کی شان میں کافی گستاخی کر چکا تھا۔

میمنے کے جسم کا سارا خون اُس کے دل میں کھینچ آیا تھا اور وہ بڑی ہی مصیبت اور مظلومیت سے شیر کی طرف دیکھ رہا تھا، لیکن تم نے وہ کہاوت سنی ہوگی کہ گھوڑا اگر گھاس سے دوستی کرے تو تو بھر کھلے کیا۔

چنانچہ شیر نے میمنے کی تسکابوٹی کر کے اُسے برابر کر دیا۔

سننے والوں کی صف سے ایک نوجوان کھڑا ہوا اور اس نے کھٹکھارتے ہوئے کہا۔ "محترم بزرگ! یہ قصہ اس مقام پر ختم نہیں ہوتا، اس سے آگے بھی جاتا ہے۔"
قصہ گوجھ بھلا اٹھا۔ "بکتے ہو یہی اس کا انجام ہے۔"

تب حاضرین کے بے حد اصرار پر نوجوان نے اس کے آگے کا قصہ بیان کیا۔

— شیر میمنے کو ٹھکانے لگا کر اپنی جگہ واپس آیا تو اس نے چشمے پر منہ صاف کیا اور

خوب سیر ہو کر پانی پیا۔

اور جب یہ سب کر چکا تو اپنی عادت کے مطابق اُس نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا اور نشیب کی طرف نظر دوڑائی۔

نشیب کی جانب بھر رہی میمننا اسی جگہ کھڑا پانی پی رہا تھا۔

شیر غصے سے بے اختیار ہو کر گر جا۔

تو پھر آگیا چشمے کا پانی گندہ کرنے۔ تیری یہ ہمت۔

میمنے نے دہی جواب دیا جو اس سے پہلے دے چکا تھا۔

"جہاں پناہ! پانی بلندی سے دھلان کی طرف آتا ہے، دھلان سے بلندی کی طرف نہیں جاتا۔"

چنانچہ اس بار بھی شیر اسی انداز سے نشیب پر آیا، اور اس نے میمنے کی بوٹی بوٹی نوح ڈالی۔

تیسری بار بھی یہی ہوا۔

چوتھی بار بھی یہی ہوا۔

تب بار بار کے اس عل سے، فضا نے اس پورے مکالے کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیا۔
اور جب وہ مینا سامنے آتا تو فضا خود بول اٹھتی۔

”گستاخ چھو کرے، تیری یہ مجال کہ میرے پینے کے پانی کو گندہ کرے۔“
پھر وہی فضا سمجھنے کا بھی جواب دیتی۔

”جہاں پناہ! پانی بلندی سے ڈھلان کی طرف آتا ہے، ڈھلان سے بلندی کی طرف نہیں جاتا۔“

اس مکالے کے بعد شیر اپنے مخصوص انداز سے نشیب کی جانب آتا اور سینے کو چیرھاڑ کر کنارے لگا دیتا۔

پر اس بھاگ دوڑ سے شیر کافی نڈھال ہو گیا تھا۔
اس کی آنکھوں کے آگے تتلیاں سی ناچ رہی تھیں، منہ پر کھیاں جھنک رہی تھیں، اور وہ سوچ رہا تھا کہ اب سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔
تب قصہ گو نے سوال کیا۔

”میرے عزیز یہ بتاؤ کہ پھر یہ قصہ ختم کہاں ہوتا ہے۔“

صورت اک بے کیفی کی

آپ ہی سوچئے کہ صبح سے شام تک اگر آپ ایک ایسی تصویر دیکھتے رہیں کہ جس کی آنکھوں میں ٹیکڑوں میں ٹیکڑیوں کا جہنم روشن ہو۔ ایک قدم آگے بڑھے اور اس کے پکٹے شعلوں نے آلیا۔ جس کے چہرے پر ایسی مہیب گھٹائیں اٹھ رہی ہیں جو ایک عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔ جس کے پیر میں سرخ ہیں کبھی نہ بجھنے والی آگ کا جنگل بسا ہو اور جس کی پیشانی پر شکن در شکن جال سا بچھا ہو۔ تو پھر آپ کا کیا عالم ہوگا۔

ایسی صورت دیکھ کر آپ خوفزدہ ہوتے ہیں، جلتے ہیں کڑھتے ہیں — کب یہ نیست و نابود ہو جائے، کب یہ فنا کی گھاٹ اتر جائے۔ آپ نہ ان احساسات کا کوئی صحیح نام دے سکتے ہیں، اور نہ ان کی بربادیوں کے سلسلے میں کسی خاص فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں۔ بس یہ کہ کسی طرح وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب صبح تا شام ایک ہی کمرے میں رہنا ہو، اس عالم میں کہ ایک اہم گوشہ اس تصویر کے لئے مخصوص ہو تو آپ اس سے نظریں بھی نہیں چلا سکتے۔ آنکھیں بند کر کے

تو آپ کمرے میں چل پھر نہیں سکتے۔ یہاں تو یہ صورت تھی کہ —

ایک ذرا اگر دن اٹھائی دیکھ لی۔

میں نے اس مسئلے پر ایک آرٹسٹ دوست سے گفتگو کی، اور کئی ایک قسطوں میں اسے ساری بات بتا سکا کہ وہ غریب بھی پڑا بھاگتا دوڑتا سا آدمی تھا۔

میں نے آرٹسٹ سے کہا — ”تم نے اس کی آنکھیں دیکھیں؟ — اس کا چہرہ دیکھا؟ — اس کا پیر بن سرخ۔ اور اس کی پیشانی — اُن میرے خدا کتنی ہی متوازی لکیریں اس پر کھینچی ہیں۔“

آرٹسٹ نے کہا — ”ہر ایک لکیر دس سال کی نشانی ہے۔“

میں نے کہا — ”ہوش میں ہو، اسے وہ ہزار ہزار سال کی نشانیاں ہیں — خدا کی پناہ۔“ اُس نے زیر لب مکررتے ہوئے کہا — ”تم ضرورت سے زیادہ خائف ہو۔“

نہایت رد و قدح کے بعد بالآخر یہ طے پایا کہ آرٹسٹ کئی نشستوں میں اس کام کو پورا کر دے گا، اور اس ہمیب تصویر سے ایک قابل قبول صورت نکل آئے گی۔

آرٹسٹ اکثر وقت نکال کر آجاتا، اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس تصویر کی طرف متوجہ ہو جاتا۔

تصویر۔ رنگ، قلم اور برش۔

اس درمیان میں اپنی دنیا میں گم رہتا۔ آرٹسٹ تصویر کی گرم آندھیوں کو برآمد کر کے، اس کے اندر صبا کی مست خراپی آباد کرنا چاہتا تھا۔

دیر تک وہ تصویر میں ڈوبا رہتا اور تب وہ ٹھنڈی سانس لیتا، جویسے وقتوں میں لی جاتی ہے، جب آدمی تھک کر کام دوسرے دن کے لئے اٹھا دیتا ہے۔

آرٹسٹ میرے قریب تپائی پیرا کر بیٹھ جاتا۔ وہ پکیٹ سے سگریٹ نکال کر منہ میں دباتا، اور اسے ایک خاص انداز سے جلا کر، میری طرف دھواں پھینکتے ہوئے کہتا۔

”اب کسی اور دن آؤں گا۔“

اُس دن میں نے تصویر کو دیکھا تو مجھے یوں لگا کہ موسم کچھ بدل رہا ہے، لیکن میرے دل نے مجھے بھٹلاتے ہوئے کہا۔

”دراصل تم اب ان پتے موسموں کے عادی ہو گئے ہو۔“

آرٹسٹ کو جب کبھی موقع ملتا وہ آجاتا اور ادھر ادھر کی رسمی بات چیت کے بعد تصویر کو درست کرنے میں لگ جاتا۔

تب ایسا ہوا کہ اگر میرا دل کہتا کہ یہ محض تمہارا خیال ہے کہ تصویر سر و طبع ہو گئی ہے، تو میں سختی سے اس بات کو غلط ثابت کر دیتا، کیونکہ مجھے یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ بلاخیز موسم تیزی سے گزر رہا ہے اور اب کوئی دم میں ٹھنڈی ہواؤں کے قافلے بس آیا ہی چاہتے ہیں۔

پھر ایک دن آرٹسٹ نے اعلان کیا کہ آج اس کا کام ختم ہو گیا۔ اس کے چہرے پر فتح مندی کا احساس جھلک رہا تھا۔

اُس نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ”اب ذرا اس تصویر کی طرف دیکھو۔“

میں نے تصویر کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوش و خرم آبا دیوں کا گیت ابھک رہا تھا۔ ماتھے پر سنہری کرنیں چمک رہی تھیں، چہرے پر ایک روشنی شہر جگمگا رہا تھا اور اس کے سپر ہین میں سیکڑوں ستارے جھلک رہے تھے۔

میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ ”آرٹسٹ تم واقعی گرہ ہو۔ تم نے بالآخر اس کے اندر کے شیطان کو نکال پھینکا۔“

مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ میں آسمانوں میں اڑا جا رہا ہوں۔ کبھی یہ کہ میں ایک تنہا کشتی پر کھڑا کرکس موجوں کے سینے پر تیزی سے بہتا جا رہا ہوں۔ — ننگے پاؤں برفیلی سطح پر دوڑتا جا رہا ہوں۔

میری خوشی نے دراصل میرے اندر کبھی نہ ہونے والی باتوں کی سرستی بھر دی تھی۔

کئی دنوں تک مجھے اس کیفیت نے مرثا رکھا۔

لیکن جب یہ خوشی کی لہر گزر گئی اور میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا تو میں نے سوچا۔ میں بھی

اُن کی تجربہ گاہ

وہ آج سویرے سے اُس کی راہ دیکھ رہے تھے۔

پر یہ کیسے کہا جاسکتا تھا کہ وہ اسی کی راہ دیکھ رہے تھے، کیونکہ ان میں سے ایک جس نے گہرے رنگ کی بڑے بڑے چمک والی قمیض اور گہرے ہی رنگ کی چُست پتلون زیب تن کر رکھی تھی، جس کے بال کی بلیں گردن سے بہت نیچے تک اُتر آئی تھیں اور سائڈ لاک کے نیچے چہرے پر تقریباً تین دن کا شیونظر آ رہا تھا، جس نے گلے میں ایک سونے کی چین ڈال رکھی تھی، کہتا تھا کہ اُسے کم از کم ایک دس کیلو کی مچھلی کی ضرورت ہے۔

دوسرا جس کے چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی، جس نے سر پر انڈیکیپ جا رکھی تھی، جس کی قمیض پر شوخ رنگ کا پرنٹ تھا اور پتلون بل باٹم تھی، ایک کشادہ سینہ قوی ہیکل مرع کی بات کر رہا تھا۔

تیسرا جس کی اسپورٹس شرٹ کے پائیں جانب سینے کے قریب سیاہ دھاگوں سے کوئی چڑیا بنی تھی، جس کی پتلون کا ڈوراٹے کی تھی، جس کا شیو بالکل تازہ تھا اور جس نے گلے میں ایک صلیب

کتنا دیرمانہ ہوں۔ نہ میں ہوا پر اڑ سکتا ہوں، نہ اکیلے کشتی پر کھڑا سمندر کی بدست لہروں پر بہہ سکتا ہوں اور نہ ہی تنگے پاؤں برف کی سطح پر دوڑ سکتا ہوں۔

خوشی کیا کسی معصوم خواہشیں رکھنے والے بچے کا نام ہے؟

یوں ہی انتہا درجے کی خوشی روح کو مردہ بنا دیتی ہے۔

مجھے یوں لگا کہ پھر وہی بے کیفی مجھ پر غالب آتی جا رہی ہے۔

تب ایک دن عجیب ایک سانحہ سا پیش آیا۔ میری بیوی ایک پلیٹ میں کچھ سیب اور ایک چھری لے کر آئی اور اسے میز پر رکھ کر کچن میں چلی گئی۔

میں اپنے بستر پر لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ایک باب ختم کر کے میں نے کتاب نشان لگا کر رکھ دی اور میز پر رکھے سیب کی طرف متوجہ ہوا۔ اچانک میری نظر اس تصویر پر پڑی تو میرے منہ سے چیخ نکلی گئی۔

اس کی آنکھوں میں پھر وہی چمکاریاں نمودار آئی تھیں، اس کے ماتھے پر پھر وہی صدف درصاف شکنیں کھڑی تھیں، اس کا پیرہن پھر اسی طرح سُرخ ہو گیا تھا۔ اور اس کی آنکھیں اس چھری پر جمی تھیں جو سیبوں کے درمیان رکھی تھی۔

میری چیخ سن کر میری بیوی دوڑتی ہوئی آئی تو میں نے اس سے کہا۔

”آرٹسٹ آئے تو اس سے کہنا کہ یہ تصویر بچاؤ کر چھینک دے، اور اس کی جگہ ایک نئی تصویر

بنائے۔“

”یہ تصویر کبھی نہیں سدھرے گی۔“

قربت کی دُوری

یوں لگتا تھا کہ ہر بار جب وہ اپنی آنکھوں کو کچھ اور سمیٹ لیتا تھا، تو وہ دس سال پہلے کے عہد میں چلا جاتا تھا۔ کئی بار کے اس عمل نے اسے بالآخر تیس سال پہلے کے زمانے میں جامع مسجد کی میٹریوں پر لا کر کھڑا کر دیا۔

ہم ایک دوسرے سے جدا ہو رہے تھے۔
”انشار اللہ جلد ہی ملیں گے۔“

اس طرح ہم تیس سال بعد ایک ایسے شہر میں بغل گیر ہوئے، جو اب اس کا شہر تھا اور جہاں میری حیثیت ایک مہمان کی تھی۔

وقت نے اس سے بہت کچھ چھین لیا تھا۔ اس کے فانت، اس کی آنکھیں، اس کی آواز اور اس کی شکل۔

میرے باب میں سامنے کی دنیا کس قدر مضبوط تھی، لیکن اگر ہم دونوں ایک دوسرے کی من کی دنیا میں داخل ہوتے تو میرے یہاں زیادہ بربادی اور زیادہ شکستگی کے آثار ملتے۔

لیکن اس کا مجھے پہچان لینا واقعی حیرت انگیز تھا، کیونکہ میں تو اس کے دفتر میں اس سے ملنے گیا تھا، اور مجھے اس بات کا بخوبی علم تھا کہ اشفاق کا نام لینے پر جو شخص مجھے اس دفتر میں ملے گا، وہ بجز اس کے اور کوئی دوسرا نہیں ہوگا۔

پر اُسے تو میری کوئی خبر نہیں تھی، اس کے باوجود چشمِ زدن میں کئی پھلانگیں لگا کر اس نے مجھے بلا آخر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر دریاخت ہی کر لیا۔

مجھے اس کی یادداشت اور اس کی ذہانت پر خوشی ہوئی۔

”چلو اگر دل اور دماغ ساتھ دیتے ہیں، تو یہ چہرہ مہرہ تو محض ظاہری چیزیں ہیں۔“

اب ہمارے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ گفتگو کہاں سے شروع کی جائے، کیونکہ ہمارے پیچھے تین دہائیاں منہ پھاڑے کھڑی تھیں۔

”تم کیسے رہے؟“

”نیاز کہاں ہیں؟“

”نہتے کیسے ہیں؟“

میرے ہر سوال کا اس نے مختصر سا نیا تلا اور رسمی انداز کا جواب دیا، پھر دوسری ہی ساعت وہ میرے دوست کی طرف متوجہ ہو گیا کہ اس سے اس کا صرف چھ ماہ کا فاصلہ تھا، یوں کہ دونوں ایک ہی شہر میں رہتے تھے، اور چونکہ وہ شہر ہمہ وقت بھاگتا رہتا تھا، اس لئے ملاقاتیں نصف سال بعد، سال بعد، اور کبھی کبھی کئی ایک سال بعد ہوا کرتی تھیں، اور وہ بھی لمحوں کے حساب سے، کیونکہ جلد ہی وقت انھیں ٹھوکے لگانے لگتا۔

”ہو چکیں باتیں اب آگے بڑھو۔“

مگر یہ کہ میرے دوست اور اس کے مابین جو رشتہ تھا، اس میں ایک تسلسل کا احساس ہوتا تھا، وقت کی کڑیاں ایک دوسرے سے جڑی نظر آتی تھیں۔ میرے ساتھ یہ تھا کہ ایک طویل مدت کی خلیج نے میرے اور اس کے درمیان کسی طرح کے بھی تسلسل کو یکسر ختم کر دیا تھا۔

ایک دہائی پہلے کی باتیں۔ دو دہائی پہلے کی باتیں۔ تین دہائی پہلے کی باتیں۔ اور یہ باتیں

تو اسی وقت ممکن تھیں، جب ہم نہایت یکسوئی سے بیٹھتے، اسے بھی فرصت ہوتی، اور مجھے بھی فرصت ہوتی، لیکن اس بے قرارے شہر میں کیا یہ سب کچھ ہو سکتا تھا۔

لیکن میں نے سوچا، اُس نے آنکھوں کے کئی نادائے بدل کر مجھے پہچان لیا، اس طرح گویا ایک پرانے رشتے کی تجدید ہو گئی۔ اب جب کبھی ہم اطمینان سے بیٹھیں گے تو پھر باتیں ہوں گی۔ تب میں نے اُسے اپنے دوست سے تقریباً چھینٹے ہوئے کہا۔

”چانتے ہو یہ جو تمہارا پتہ میری ڈائری میں درج ہے، اسے کوئی بیس سال پہلے تمہارے ماموں نے مجھے دیا تھا۔“

اس نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا — ”میں بھی تمہیں کبھی نہیں بھولا، یقین نہ آئے تو اپنے دوست سے پوچھ لو۔“ دوست نے گردن ہلا کر اس کی باتوں کی تصدیق کر دی۔

”اور ہاں تمہارے ماموں“ میں نے اُس کے ماموں اور ان کے خاندان کی ایک مختصر سی روئداد اسے سنادی کہ وہ سب میرے ہی شہر میں رہتے تھے۔

میری باتوں کا اس نے کوئی خاص تاثر نہیں لیا۔ تب میں نے سوچا۔

”وقت بڑا قاتل ہوتا ہے، وہ رشتے ناطے کے درمیان بھی دیواریں حائل کر دیتا ہے۔ کیا اپنے حقیقی ماموں کی بد حالی کا ذکر سن کر محض ایک بے تعلقی سا ”اچھا“ اسے زیب دیتا تھا؟“ میں نے اُسے اپنا ”جیلانی منزل“ والا پتہ دیا تو اس نے چھوٹے ہی کہا۔

”آفاق تو ادھر اکثر جاتا رہتا ہے۔“

میرے استفسار پر اس نے بتایا — ”میں نے جج سے واپس آ کر دوسری شادی کر لی تھی، یہ کوئی ستائیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔“

اس کے بعد اس نے حبیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی اور کچھ دیر کے لئے سگریٹ کے دھوئیں میں کھو گیا، ادھر میں اس کے حرد و خال اور اس کے گرد و پیش کی ایک تصویر اپنے ذہن میں بناتا رہا۔

اشفاق احمد جو تین دہائیاں پہلے مجھ سے جدا ہوا تھا، اب ایک نئے شہر میں رہتا ہے، بظاہر تو ٹوٹا ٹوٹا سا دکھائی دیتا ہے، لیکن بہ باطن خاصا مستحکم ہے — اپنا گھر — بال بچے — اور ابھی

یہ بات پورے ذوق کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ اس کے اندر ماضی کی جنگاریاں ساری کی ساری بچھ گئیں، یا ابھی دو چار روشن ہیں۔

سگریٹ سے فراغت پا کر اس نے اپنی جیب میں میرا پتہ رکھتے ہوئے کہا۔
”اچھا تو میں جلد ہی تمہارے یہاں آؤں گا۔“

ایک دن میں باہر سے آیا تو معلوم ہوا کہ وہ دیر سے میرا انتظار کر رہا ہے۔
”تمہیں یہاں آنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی؟“ میں نے اسے شکر گزار لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں میں بڑی آسانی سے سرکلر ٹرین پر بیٹھ کر یہاں آ گیا۔“
وہ دیر سے بیٹھے رہنے کے باوجود مجھ سے زیادہ تھکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ روزے کے دن تھے، اس نے کسی ٹھنڈے یا گرم کے متعلق پوچھنا یقینی خلاف تہذیب تھا، پھر بھی میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

اُس نے کہا۔ ”میرا تو روزہ ہے، اور تم تو اس شہر سے آئے ہو جہاں۔۔۔۔۔۔“
میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”وہاں اب بھی سب کچھ ثابت و سالم ہے۔
دین و ایمان۔“

پھر میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس عہد میں لے چلا جو ہم دونوں کا تھا۔
سمندر جیسی گنگا کے کنارے بسا، پر ذوق بازاروں والا الف لیلوی شہر۔ اس کی پریچ گلیاں۔
ایک سمت آم کے باغات کہ جن کے درمیان مار کے طویل القامت پیر محافظ بنے کھڑے رہتے ہیں۔
وہ بھی بڑی سرعت سے بندر روڈ، صدر، لالو کھیت اور سوسائٹی سے نکل کر، میرے شہر میں،
اپنے سابق شہر میں چلا آیا۔

اور آنکھوں میں چمک تو نئے جلوؤں سے بھی پیدا ہوتی ہے، اور پرانے جلوؤں کی بازیافت سے بھی۔

اچانک اسے کچھ یاد آگیا۔

”ملا جی زندہ ہیں۔“

ایک ٹمٹما سا بلب۔ دو چار لمبی میزیں، دو چار لمبی بنچیں۔ کنارے ایک گندہ سا اسٹور اور باورچی خانہ، جس کی ایک الماری پر کچھ ازکار رفتہ پلیٹیں، المونیم کے گلاس، پیالے لکڑی چمچے ہوئے۔ ایک طرف ایک سخت بچھا ہوا، جس پر کیش بکس سنبھالے بیٹھا کرتے ملائیر حسین پروپرائٹر ہوٹل ملائیر حسین۔“

اشفاق کا کھاتہ کھلا ہوا تھا۔ تین چار آنے میں ایک کپ چائے کے ساتھ غنیمت سا کھانا مل جاتا تھا۔ مہینے کے آخری سرے پر اشفاق کھاتہ کھول کر اپنا حساب کرنے بیٹھتا تو کل پندرہ سولہ روپے کی رقم بنتی۔ اس رقم کی ادائیگی کے بعد وہ اپنے صفحے پر ایک بڑا سا کراس بنا دیتا اور پھر ایک نیا صفحہ کھول دیتا۔ ملا جی پڑھے لکھے نہیں تھے، لیکن ان لمحوں میں وہ بھی دل ہی دل میں کچھ حساب کرتے جاتے، اور بسا اوقات ایسا ہوتا کہ وہ اشفاق کے حساب سے مطمئن نہیں ہوتے تو اسے وہیں ٹوک دیتے۔

”اشفاق بابو حساب کچھ گڑبڑ ہے، پھر سے جوڑو۔“

امتحان کے دنوں میں اکثر رات گئے دمنٹار بھائی رونی صورت بنا کر اعلان کرتے۔

”دوستو آج کی رات ہم پر بہت بھاری ہے۔“

ہم جو، کم کر پوچھتے۔ ”وجہ دمنٹار بھائی“

”اسٹوڈین ایک قطرہ تیل نہیں ہے، چائے کیسے پئیں گے؟“ دمنٹار بھائی کو پڑھنے

لکھنے سے زیادہ چائے کی فکر رہا کرتی تھی۔

اور تب ہمیں غور و فکر کے بحر بے پایاں میں غوطے لگاتے دیکھ کر، اشفاق ایک زوردار

غیر بلند کرتا۔ ”ملا جی زندہ باد۔“

ملا جی ہوٹل ہی میں سوتے تھے سہم رات کے سنڈے میں ان کا دروازہ کھٹکھٹاتے تو وہیں

سے ہانک لگاتے۔ ”کیوں تنگ کر رہے ہو سونے دو۔“

”ملا جی اگر آپ نے دروازہ نہیں کھولا تو ہم ساری رات اسی طرح کھٹکھٹاتے رہیں گے بہتر یہ ہے کہ۔“

تب ملاجی بکتے بھکتے اُٹھتے۔ ”تم لوگوں کو نیند نہیں آتی ہے؟۔ گھر میں تو کتنے والا کوئی بوڑھا نہیں ہے جو اتنی رات گئے سنان شرک پر لنگھ آتے ہو؟۔“

اس پر مختار بھائی کہتے۔ ”ملاجی امتحان قریب ہے اور اگر چائے نہ ملی تو ہمارا جاگن ناممکن ہو جائے گا۔“ حالانکہ ہم میں سے ہر شخص یہ جانتا تھا کہ چائے پی کر مختار بھائی کو بڑی گہری نیند آتی ہے۔

اس کے بعد ملاجی کبھانے شروع ہو جاتے۔
”کوئکہ نہیں ہے۔“

”ہم اپنی ہڈیاں جلا دیں گے۔“

”شکر نہیں ہے۔“

”بھیکی بھی چلے گی۔“

”دودھ نہیں ہے۔“

”ہم تو کالی چائے کے رسیا ہیں۔“

”پتی بھی نہیں ہے۔“

اس پر ہم سب بیک آواز میں جھنجھٹتے۔ ”ملاجی ایسا فلم نہ کیجئے، ہم لوگ مر جائیں گے۔“

تب ملاجی پگھل جاتے۔ ”تم لوگ نہیں مانو گے۔“

ہماری گفتگو کے دوران ’CANARY‘ آتی — ’LONDON LAVENDER‘

— سود اور رتبہ کا حساب اور پھر چرچل کا قول آجاتا۔

اشفاق کو کچھ بہت پسند تھے۔ چنانچہ ان دلوں ہم لوگ کہا کرتے۔

”ASHFAQE SAYS KULCHA'S FALL IS OUR OWN“—

اور پھر آخر میں چائے آجاتی۔

ملانذیر حسین اور ان کا ہوٹل۔ ان کا ملازم علی جان — ہوٹل کے سامنے قتلے

کی لال عمارت، جس سے اک ذرا پرے سُرخ روشنی کا شہر آباد تھا۔

یادوں نے کہاں کہاں نہیں بسیر لیا۔ اور جب میں ان پناہ گاہوں سے واپس لوٹا تو اس اجنبی شہر میں، میرے سامنے کے صوفے پر اشفاق بیٹھا نظر آیا۔

”تم نے ملاجی کے متعلق پوچھا تھا۔ اب تو ان کی قبر کا بھی نام و نشان نہیں ملتا جہاں ہوٹل تھا، وہاں ایک بے حد پردہ روتی سا مارکیٹ بن گیا ہے اور شب و روز ہوپا ریوں کی یورش رہتی ہے۔“

اشفاق نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور چند ثانیوں تک خلاؤں میں گھورتا رہا، اور پھر جب اس دنیا سے لوٹا تو اس نے اپنا احوال بیان کرنا شروع کر دیا۔

”آمنہ میڈیکل کے فاسٹل ایر میں ہے۔ اشفاق اور آفاق انجینئرنگ میں ہیں، فلاں بی۔ اے میں ہے۔ اس کے بعد انٹر، ہائی اسکول اور ساتویں جماعت۔“

مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ اس کے بچے اپنا کیریئر بنا رہے ہیں۔ لیکن میں نے سوچا، یہ تھوڑی دیر کا مناسب حدِ عنیمت ہے۔ اس وقت کو ہم ان بستیوں میں کیوں نہ گذاریں جو میری بھی تھیں اور جو اشفاق کی بھی تھیں۔

”تمہیں ایک پیسے پیالی والی چائے یاد ہے؟“

اس پر اس نے کہا۔ میں نے ہی تو تمہیں وہ چائے خانہ دکھلایا تھا۔ ماسٹر الطاف کے گھر کے قریب تھا۔“

سردی کے دن تھے۔ الطاف صاحب نے بچے صبح اپنے گھر بلاتے۔ سٹھ اندھیرے ان کے گھر ٹیوشن پڑھنے والے لڑکوں کی بیٹری بھاڑ شروع ہو جاتی۔ ان کے یہاں حساب اور جغرافیہ پڑھ کر ہم گنیش شنکر جی کے یہاں چلے جاتے جو ہمیں انگریزی اور گریمر پڑھاتے تھے۔

یہ دونوں ٹیچر پیسے کے معاملے میں بڑے سخت تھے۔ اشفاق نے کیا یہ کہ ایک دن چھپے پرانے کپڑوں میں باری باری ان دونوں کے یہاں جا کر، نہایت دردناک لہجے میں اپنی پلتا چھیڑ دی۔

”ماسٹر صاحب میرے والد فوج میں سکند لفٹنٹ تھے۔ خبر آئی ہے کہ وہ محاذ پر

مارے گئے۔ چونکہ میں گھر میں سب سے بڑا ہوں، اس لئے ان حالات میں میرا پاس ہونا بے حد ضروری ہے۔“

ان دونوں نے ترس کھا کر کہا۔ ”اچھا تو کل سے آجانا، پیسے کا کچھ خیال نہ کرو۔“ ہم نے جب اسکول کے دوستوں کے سامنے اس راز کا انکشاف کیا تو لڑکوں پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ”کمال کر دیا بھئی اشفاق نے۔ تینوں جیسی صورت بنا کر اس نے بڑے بڑے سنگدلوں کو رام کر لیا۔“

در اصل اشفاق کو ڈرامائی سچویشن پیدا کرنے میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔

اور پھر ان ہی راہوں میں ہمیں ایک پیسے پیالی دالی چائے مل جاتی تھی۔

اچانک ہمارے درمیان مختار بھائی کا ذکر چھڑ گیا۔

”مختار بھائی دراصل ہمارے وہ بانو تھے، جو ایک حادثے میں کٹ چکا ہے۔“ اشفاق کچھ جذباتی ہو گیا اور دیر تک اس حادثے کی تفصیلات پر گفتگو کرتا رہا۔

اتنے میں پڑوس کی مسجد میں عصر کی اذان ہونے لگی۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے

سے رد کئے ہوئے کہا۔ ”پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو۔“ اس نے فی الوقت میرا مشورہ یہ ہے کہ تم نماز پڑھ لو۔“

ایک دن میرا دوست مجھ سے ملنے آیا تو باتوں ہی باتوں میں اس نے مجھ سے کہا۔

”چلو اشفاق سے مل آئیں۔“

اشفاق کانے کوسوں دور نیوکا لونی میں رہا کرتا تھا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی لمبی ڈرائیو

تھی۔

اشفاق نے اپنی بیوی سے ملایا۔ میری ڈاکٹر بیٹی تو اپنے چچا کے یہاں گئی ہوئی ہے بڑے

لڑکے کہیں میرے پائے میں نکلے ہوئے ہیں۔ چھوٹے لڑکے پڑھ رہے ہیں۔

کبھی دونوں میاں بیوی پاس ہی پاس کی بستیوں کے رہنے والے تھے۔

بیوی نے دریافت کیا۔ ”میری بستی کے متعلق آپ کو کچھ علم ہے؟“

میں نے کہا۔ ”اب بھی وہاں بہت سارے ہم صورت آباد ہیں۔“

اس پر بیوی نے اشفاق کو گھور کر دیکھا۔

اس نے سرگوشیوں میں کہا۔ ”کیا تم نے کہہ دیا، اب کل ہی سے ہنگامہ شروع کر دیں گی

کہ میرے جانے کا انتظام کر دو۔“

پتہ چلا کہ اشفاق اب تک بیوی پر یہ تاثر دیتا رہا تھا کہ بستی دیران ہو چکی ہے، اور

ہما شتا شہروں میں بکھر چکے ہیں۔

بیوی کچن کی طرف گئی، تو اس نے چپکے سے پوچھا۔

”تمہیں کیسی ہے؟“

”تمہیں یا جُھیں؟“

میرا دوست ان ناموں سے واقف تھا اس لئے وہ زیر لب مسکرایا۔

اسے اتفاق ہی کہنے کہ ایک دن گر میز رٹتے رٹتے ہم لوگوں کی نظر اچانک سامنے والے

مکان کی کھڑکی پر جا گئی۔ کچن سے دھواں اٹھ رہا تھا، اور اس دھوئیں کے نیچے ایک لڑکی اٹکھیں

مٹمٹاتی جاتی تھی اور اپنے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔

میں نے اشفاق سے کہا۔ ”اشفاق آج تک ہم لوگ کہاں رہے؟ ہماری بے خبری کا

یہ عالم ہے کہ جہیں یہ تک نہیں معلوم تھا کہ بہار سامنے کے مکان میں اُتر آئی ہے۔“

کچھ دیر ہم لوگ کھڑکی سے لگے اس بہار کے جلوؤں میں کھوئے رہے۔

اتنے میں آواز آئی۔ ”تمہیں ادھر آؤ۔“

اشفاق نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو یہ آپ کا نام ہے۔“

میں نے کہا۔ ”جی ہاں آپ ہی کا نام تمہیں ہے۔“

پھر ہم نے اس معاملے کو مختار بھائی کے حضور میں پیش کیا۔

میں نے تو چپکے سے یہ کیا کہ اپنے اندر ایک تبدیل جلا کر اپنے دل کو اس کی روشنی سے نور کر لیا۔

ڈال رکھی تھی، بار بار ہرن کے کباب کا ذکر کر رہا تھا۔

چوتھا جس نے قلندروں کی وضع میں چاروں ابرو کا صفایا کر دیا رکھا تھا، جس کے جسم پر ایک گلابی رنگ کا کرتا تھا، جس پر سُرخ دھاگے نے خوبصورت گل بوٹے اُٹھائے تھے، جس کے نیچے سیاہ رنگ کی ایک چمکدار پتلون تھی اور جس نے ایک ہاتھ میں کڑا پہن رکھا تھا، ایک قد آور بکرے کے حجر میں مڑا جا رہا تھا۔

بہر حال یہ کہ جب وہ ملا تو جیسے اُن کے چہروں پر بہاریں ٹوٹ پڑیں، اور انہوں نے ایک بے حد خوشگوار نوڈ میں اُسے گھیر لیا، اس واسطے وہ اُن سے ذرا بھی خائف نہیں ہوا۔ یوں بھی وہ کافی موٹی جلد کا نہایت مضبوط اعصاب والا متوسط العمر آدمی دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے براؤن شیڈ کا ٹریلین کا سوٹ پہن رکھا تھا، جس کے نیچے گہرے عنابی رنگ کی ٹائی تھی، جسے ٹائی پن نے دبا رکھا تھا۔ چہرہ صاف تھا اور آدھا سر پھلی رات کی بر فباری کی لپیٹ میں آچکا تھا۔

اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا: ”کہئے میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں۔“

”بات یہ ہے جی.....“

”بابو جی کہو، انہیں پورا آسمان دینا چاہئے۔“

”بڑے بھیا کیسا رہے گا۔“

”ہاں ہاں چا جا جی بھی کہہ سکتے ہو۔“

”ویسے سر جی بھی چل سکتا ہے۔“

”خیر خیر آگے فرمائیے۔“

”پہلے ہم لوگ اپنا تعارف کرادیں۔“

”یہ جی سورج ہے، میں چاند ہوں، یہ تارہ ہے اور یہ بادل ہے۔ ہم سب آکاش سے اُترے

ہیں ایک خاص مشن لے کر۔“

”اور میں جی محل چند ہوں۔ یہاں مرکزِ نمبر پر میرا ایک موٹروں کا کارخانہ ہے۔ مجھے پیشاب

شکر آنے لگی تھی، سوڈا کُترنے پیدل چلنے کا مشورہ دیا ہے۔ گھر یہاں سے کوئی پُرامیل پر ہے۔ پیدل

اشفاق آہیں بھی بقربا، اور دھیسے سُروں میں کچھ اشعار بھی پڑھ لیتا۔

لیکن مختار بھائی تو بہت تیز چلنے والے لوگوں میں تھے۔ انھوں نے تو کمال ہی کر دیا کہ ایک دن 'صاف پھپھتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں' والا شعر پڑھ گئے۔

ایک صبح کا واقعہ یہ ہے کہ ہم سب کھڑکی پر جھکے ہوئے تھے، اشفاق ہاتھوں سے کچھ اشارہ کر رہا تھا اور مختار بھائی الٹے سیدھے اشارہ پڑھ رہے تھے کہ اتنے میں دادا جان کمرے میں آ گئے، اور انھوں نے آتے ہی ہم سے استفسار کیا۔

”کیا کر رہے ہو تم لوگ۔“

”کچھ نہیں دادا جان وہ سامنے کی چھت پر بندرا چک پھاند کر رہا ہے۔“

”بھئی امتحان قریب ہے پڑھائی پر زیادہ دھیان دو۔“

ان کے جانے کے بعد دیر تک ہماری سانس قابو میں نہیں آئی۔ اور جب ہم ذرا سنبھلے تو ہم نے سوچا کہ اگر دادا جان کو حقیقت کا علم ہو جاتا، تو آج قیامت ہی ہوا ہو جاتی۔

”اشفاق سلمہ تم بھی نہیں بخشے جاتے، وہ جوتے پڑتے کہ آئندہ سے ٹھنڈی آہیں بھرنابھول جاتے۔“

لیکن دادا جان کا خدو ملگا رحمت علی بے حد چالاک تھا۔

ایک دن وہ بھی عین موقع پر پہنچ گیا، اور جب اس نے ہم سے دریافت حال کیا، تو ہم نے اس کو بھی وہی بتایا جو ہم دادا جان کو بتا چکے تھے۔

”چھت پر نہیں باورچی خانے میں تھا۔ اس کے بال اس کی کمر کو چھو رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں دے جگمگا رہے تھے، اور اس کے چہرے پر کرنیں بھوٹ رہی تھیں۔“

اشفاق نے کہا۔ ”تیرا بیڑا غرق۔“

اور مختار بھائی نے کاغذ کاٹنے کی چھری اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”رحمت علی ہم تمہارا

MURDER کر دیں گے۔“

رحمت علی کھی کھی ہنستے ہوئے کہا۔ ”مار دھاڑ تو بعد میں کرنا، پہلے سرکار کے پاس چلو۔“

اس پر تم تینوں نے بہ یک زبان کہا۔ ”یار کیلے مروت آدی ہے، اس کی آنکھوں میں سورا
کا بال ہے۔“

رحمت علی دیر تک ہنستا رہا ”تو پھر چمپا تے کیوں ہو؟“

اس حادثے کے بعد ہم لوگ CODE میں بولنے لگے، لیکن اسے بھی رحمت علی نے معلوم
کر لیا۔ چنانچہ ایک دن جب اشفاق نے اس کے سامنے کہا۔ ”دل میں چھین سی ہو رہی ہے۔“ تو
اس نے اپنی مخصوص ہنسی کو روک سکتے ہوئے کہا۔ ”چھین نہیں ٹمن ہو رہی ہے۔“
”یا خدا یہ تو نام تک جان گیا۔“

ان ہی دنوں مختار بھائی نے ہم لوگوں کے بھرپور تعاون سے ایک گرم سا گمنام خط ٹمن کے
نام لکھا۔ بہت سے عشقیہ اشعار چھان بھٹک کر نکالے گئے، انگریزی کی نفلوں سے استفادہ کیا گیا،
اور یہ لکھا گیا کہ غم دل کے مارے پر نزع کا عالم طاری ہے، اور اگر ٹمن سے کچھ بھی نہ ہو سکے تو وہ کم از کم
اس خط کو چوم لے، تاکہ مرے دل لے کی روح عالم ارجح میں سکون پا جائے۔

اس خط کو مختار بھائی نے گھر سے دو ڈھائی میل دور ایک لیٹر بکس میں پوسٹ کیا تھا۔

جواب آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا، لیکن مختار بھائی کا خیال تھا کہ لوہا یقینی کچھ نہ کچھ گرم
ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس خیال کے آتے ہی وہ ایک دن دفتر کے اوقات میں، یہ معلوم کرنے کے بعد
کہ ٹمن کے والد دفتر جا چکے ہیں، اس کے گھر پہنچ گئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو ٹمن نے دروازہ کھولا۔
اتنے میں ماں نے آواز دی ”کون ہے ٹمن۔“

اس آواز کو سنتے ہی مختار بھائی جو ٹمن کو کیلجے سے لگا چکے تھے، وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔
ٹمن۔

چھین۔

اشفاق میرے سامنے بیٹھا تھا۔ ”تمہیں یاد تھی ٹمن؟“

درجن بھر بال بچے، درجن بھر پوتے پوتیاں، لڑا سے لڑا سیال۔ باہر سے شکستہ حال لیکن
اندر سے بے حد ٹھوس۔ یہ رہی تمہاری ٹمن، جواب اکثر بے خطر میرے گھر آ جایا کرتی ہے۔ تھوڑی دیر

سننا سا چھایا رہا۔ پھر اس خاموشی کو توڑتے ہوئے اس نے میرے دوست سے کہا۔

”میں نے اس کاونی میں ایک اور مکان بھی بنوایا ہے، جو کرائے پر لگا ہے۔“

”آمنہ میڈیکل کرلے تو اس کی شادی کر دوں گا۔“

”کئی بچے ایک ساتھ شادی کے قابل ہو گئے۔“

”ملاجی ہو گئے۔“ ماسٹر اظاف اور ماسٹر گنیش شکر ہو گئے۔ ”ٹمن ہو گئی۔“

”اب اور کون سا موضوع رہ گیا۔“

تب ہی میں نے ان کی باہمی گفتگو میں دخیل ہوتے ہوئے کہا۔

”جب بھی تمہاری بستی کی طرف سے گذرتا ہوں، میں اسے سلام کر لیتا ہوں۔“

”یاد ہے میں بھی ایک بار تمہارے گاؤں گیا تھا۔“

دور سے کوئی آواز دے رہا تھا۔ دیکھو پگڈنڈی پر سنبھل کر چلنا۔“

نانی اماں کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں اشفاق کا دوست ہوں، تو انہوں نے بہت ساری دعائیں دی تھیں۔

پھر کچھ دنوں کے بعد یہ سہا کہ بستیاں بے ہنگم شور، دل ہلا دینے والے نعروں اور آسمان تک بلند ہونے والے شعلوں کی نذر ہو گئیں۔

کنوئیں سے ایک ضعیفہ اور اس کی نواسی کی لاش برآمد کی گئی۔ تمام خون کے دھبے۔

بے نوزی آنکھیں۔ چاروں اور بربادیوں کا ڈھیر۔ جلے مکانوں سے اٹھتا ہوا ہلکا دھواں۔

اشفاق نے کہا۔ ”اب ہماری یادیں بھی اس بستی کی طرح جل چکی ہیں۔“

اُس دن میں نے اُسے اور بھابھی کو بلایا تھا۔

کافی انتظار کے بعد بھی جب وہ لوگ نہیں آئے تو میں کہیں باہر نکل گیا۔

واپس آیا تو نوکر نے کہا۔ ”وہ صاحب اور ان کی بیگم آئی تھیں۔ آپ کو نہیں پا کر صاحب

تو کچھ نہیں بولے لیکن بیگم صاحبہ بے حد خفا تھیں۔“ آخر بلایا ہی کیوں تھا۔

میں نے خط لکھ کر اشفاق سے اپنی اس غلطی کی معافی مانگی۔ پھر کئی خط لکھے، لیکن نہ تو اس کا جواب آیا اور نہ ہی وہ خود آیا۔

میں بھی ملنے جلنے والوں میں اتنا اُٹھارہا کہ اس کے یہاں جانے کا موقع نہیں نکال سکا۔

اور آج جب میں اپنے شہر کو واپس آچکا ہوں، تو سوچتا ہوں کہ اس کا یہی احسان کیا کم تھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا اور کئی ایک بار مجھ سے ملنے آیا کہ میرا اور اس کا رشتہ تو محض یادوں کا رشتہ تھا۔

ویرانے کی جانب ایک سفر۔

۱۹۷۹ء



بستی ایک نئی ہے

سعید کے برابر دانی کرسی پر اس کا پارٹنر بیٹھا تھا۔ میز پر ایک طرف فائلوں کا ڈھیر تھا۔ دوسری طرف موٹی سی ڈائریکٹری کے اوپر فون دھڑا تھا، اور ان دونوں کے درمیان، قلمدان، سگریٹ کا پیکٹ، دیاسلائی اور ایش ٹرے۔

سعید کا پارٹنر کسی فائل میں منہمک تھا، لیکن سعید ہم لوگوں سے محو گفتگو تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس سے اور اس کے پارٹنر سے اس نوع کا کوئی سمجھوتہ تھا کہ جب اس کے دوست آئیں تو سعید فائل دیکھے اور جب سعید کے دوست آئیں تو وہ —

میں سعید کے سامنے بیٹھا تھا اور میری کرسی سے ملی ہوئی کرسی پر میرا دوست اور کبھی کا کھلنڈرا عتیق بیٹھا تھا جواب اس شہر میں نہایت ہی مغلوب الحال ساموئی دکھائی دیتا تھا۔

ہماری گفتگو میں دو چیزیں بار بار خارج ہو رہی تھیں، ایک تو ہر دو چار ٹانے کے بعد فون کی گھنٹی اور دوسری وقفے وقفے کے بعد عتیق کی ٹھنڈی آہیں۔

عتیق کی ٹھنڈی آہیں لگتا تھا کہ رہی ہوں — 'یہ دنیا بیچ و پوچ ہے، بس جھاگ چلو'۔

ایک میلی سی شیردانی، سر پر منڈھی ہوئی ایک میلی سی نخل کی ٹوپی اور پاؤں میں ربرسول کی چلیں۔

تب ہی سعید نے ہاتھوں کے اشارے سے مجھے برآمدے میں چلنے کو کہا۔

برآمدے میں پہنچ کر سعید نے کہا۔ ”یار میں اپنے لڑکے کے لئے عتیق کی لڑکی کا رشتہ مانگنا

چاہتا ہوں۔ اس نے اسی سال میڈیکل پاس کیا ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟“

میں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”خدا مبارک کرے۔“

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اور سعید لپکتا ہوا فون کی طرف چلا گیا۔

سعید کا لڑکا سائنس گریجویٹ تھا، اور کسی دور کے شہر میں ایک بڑی فرم میں جونیئر اکائونٹنٹ کی

کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، اور چونکہ غیر سرکاری دفاتروں میں سرکاری دفاتروں کی طرح ہر گلاس میں

ایک تنہائی دودھ کے ساتھ دو تنہائی بالائی ڈالنے کا رواج نہ تھا، اس لئے وہ سرکاری دفاتروں والے

فیض سے محروم تھا۔ دیسے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ابھی بچہ ہے، دودھ سے کریم نکالنا بھی ایک مستقل

فن ہے جو تجربے کی کئی منزلیں سر کرنے کے بعد ہی کسی کے ہاتھ لگتا ہے۔ سرکاری دفاتروں میں تو

کرسی سے اٹھنے والا کرسی پر بیٹھنے والے کے کان میں سب کچھ بھونک جاتا ہے۔

سعید آیا تو اس نے بتایا کہ وہ عتیق کو کل شام کی چائے پر بلارہا ہے۔ مجھے بھی وہ میری

قیام گاہ سے پک اپ کر لے گا۔

دوسرے دن حسب وعدہ سعید مجھے لینے آگیا۔

راستے میں اس نے مجھ سے کہا۔ ”یہاں زندگی بے حد پیچیدہ اور مشکل ہو گئی ہے، تمہارے

یہاں والی بات نہیں ہے۔ یہاں سب کچھ سوچنا پڑتا ہے۔“

عتیق بھی ہمارے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد وہاں پہنچ گیا تھا۔

چائے کے بعد میں نے سرچاکہ شاید سعید آج بھی مجھے کنارے لے جا کر یہ کہے کہ میں ہی یہ تجربہ

پیش کروں، ورنہ میرا بچہ یہاں کیا کام تھا، دونوں خود ہی میٹھ کر سب کچھ طے کر سکتے تھے۔

ٹی۔وی پر ایک ڈرامے کی قسط آرہی تھی، مجھے اس میں یوں دلچسپی تھی کہ میں اس کی کئی تسلیں

پہلے دیکھ چکا تھا چنانچہ میں ٹی۔وی لاونج میں سعید کی بیوی اور بچوں کے ساتھ ڈرامہ دیکھنے بیٹھ گیا
اتنے میں سعید نے مجھے آواز دی تو میں لان میں ان کے پاس جا بیٹھا۔

تب ہی سعید نے کلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”عتیق تم سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو
کرنا چاہتا ہوں۔“

عتیق نے دھیرے سے ٹھنڈی سانس لی اور سعید کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”میں
ہمہ تن گوش ہوں۔“

”تمہاری لڑکی سے میرے لڑکے کا رشتہ کیسا رہے گا، گھر کی بات ہے تمہیں کسی قسم کی
پریشانی بھی نہیں ہوگی۔“

سعید کی اس پیشکش کے بعد میں نے سوچا تھا کہ مغلوب الحال عتیق ’الذس باقی ہوس‘
کا لغزہ مستانہ بلند کرے گا اور پھر کہے گا ’جو تیری مرضی سو میری مرضی‘۔

لیکن عتیق نے تو اپنی ساری دارفہ حالی کو پرے پھینک کر بڑے سنبھلے ہوئے انداز میں کہا۔
’یار تم نے کچھ دیر کر دی۔‘

اچانک فضا بڑی بھاری بھاری سی، ساکت سی ہو گئی، اور ایسا محسوس ہوا کہ اب نہ کچھ سننے کو
باقی رہ گیا ہے، نہ بولنے کو۔

آگے کیا ہوگا؟۔ اس مہر سکوت کو کون توڑے گا؟۔

تب عتیق ہی نے اس تعطل کو ختم کیا اور بتایا کہ اس کی بیوی کا ایک رشتے کا بھانجا، ڈاکٹر
بننے کے بعد کسی اچھی جگہ پر کلینک کھول کر بیٹھا ہے، اس کی ماں عتیق کی بیٹی کا رشتہ مانگنے کے لئے
اس کی بیوی کے پاس آئی تھی اور یہ کہ اس کی بیوی نے تقریباً طے ہی کر دیا ہے۔

اس گفتگو کے بعد سیاست، ثقافت اور خانگی مسائل کی باری تھی۔

لیکن عتیق نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں روکا، اپنی سانس کو زمین بہ زمین اپنے اندر اتارا
اور پھر اس کے بعد پچھلی گفتگو کا ایک تازہ باب چھیڑ دیا۔

’ویسے سعید میں تمہارے آگے ایک اور تجویز پیش کرتا ہوں۔ ابھی تمہیں ایک اور لڑکی

بیامنا ہے۔ میرا بڑا لڑکا انجینئر ہو چکا ہے۔ کیوں نہ تم اسے اپنی غلامی میں لے لو۔
میں تو اپنے طور پر عتیق کی اس تجویز سے خوش ہو گیا، اور فی الفور میرے دل میں یہ خیال آیا کہ
اسے سن کر سعید کا چہرہ دمک اُٹھے گا۔ کیونکہ میرے یہاں تو یہ کہا جاتا ہے کہ 'لڑکے کی شادی پہلے بیہوش
رچادی'۔ لیکن لڑکی کی شادی؟۔ جس نے لڑکی کی شادی کر دی، اُس نے تو گویا اپنے سینے کا پہاڑ
اُتار بیٹھنکا۔

لیکن سعید کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

اچانک میرے دل میں یہ خیال آیا کہ مجھے بھی اس مسئلے پر کچھ بولنا چاہئے، آخر میں یہاں کیوں
بلا گیا تھا؟۔ اور اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنی کرسی ان کے قریب کر لی اور سعید اور عتیق کو
مخاطب کرتے ہوئے یوں گویا ہوا۔

"سنو دوستو، ہم پر یہ ستم ٹوٹا کہ بہت سال پہلے۔ تیس سال، چالیس سال، پچاس سال،
سوسال، حتیٰ کہ ہزار سال پہلے بھی کہہ لو تو کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ سبھی گذری ہوئی ساعتیں کافی اندھیری
راہوں میں گم ہو جاتی ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور تم جو میرے دست و بازو تھے
مجھ سے پھڑکنے۔ یہ ملنا عارضی سہی، لیکن سچ کہتا ہوں کہ تمہیں یہاں پا کر میرے اندر یہ احساس
جاگا ہے کہ یہ جو تھوڑا سا وقت تمہارے ساتھ بسر ہو رہا ہے اسے گھر نہایا جان کر میں اپنے ساتھ
لیتا جاؤں، اور جب زندگی میں اندھیری راتیں آئیں تو میں ان سیہ بخت راتوں کو ان دفتروں کا
نور بخش دوں۔"

اسی لمحے مجھے یہ محسوس ہوا کہ میری یہ گفتگو خاصی بے ربط اور بے محل سی تھی اور اس احساس
کے ساتھ ہی میں نے اس گفتگو کو یکلاخت تمت بالآخر تک پہنچاتے ہوئے ان سے کہا۔ 'مجھے
تم دونوں کی تجویز پسند آئی۔'

میری بات ختم ہوئی تو سعید نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔ "بہر حال عتیق
ہم اس غیر ملکی کے سامنے یہ فیصلہ کر لیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی تجویز پر غور کریں گے۔"
اس پر عتیق نے ایک نھکے ہوئے راہی کی طرح، اپنی سانس پرتا بولپاتے ہوئے نحیف آواز میں

کہا 'ٹھیک ہے'۔

اس طرح شگفتگی لوٹ آئی اور ادھر ادھر کی باتیں چھڑ گئیں۔

اتنے میں عتیق نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ "کافی دیر ہو گئی اب میں چلوں گا۔"

تینوں اٹھ کھڑے ہوئے سعید نے کہا 'چلو میں تمہیں پہنچا دیتا ہوں'۔

فاکسی میں سعید کے برابر عتیق بیٹھ گیا، میں پچھلی سیٹ پر تھا۔ راستے میں بھی ایک جگہ گاڑی روک کر سعید کوئی دوا لینے چلا گیا تو عتیق نے میری طرف مڑ کر دیکھا۔ 'یار تم ہی سوچو میری بیٹی ڈاکٹر ہے اور سعید کا بیٹا فقط بی۔ ایس سی ہے۔ فرم کی نوکری ہے دو ڈھائی ہزار تنخواہ آگے کچھ نہیں۔ اس سے کسی گنا زیادہ تو بری لڑکی کمالے گی۔' کوئی ٹھک ہے۔

ہم عتیق کے گھر پہنچے تو ہمارے سامنے کوک کی بوتلیں رکھی گئیں۔

سعید نے کہا 'عتیق میں بھی اس گھر میں پہلی بار آیا ہوں، اور تب اس نے ہاتھ روم کے متعلق دریافت کیا۔'

اسی درمیان عتیق مراقبے میں چلا گیا۔ سعید واپس آیا تو اس نے عتیق کو آواز دی اور اس طرح وہ اپنی دنیا سے لوٹ آیا۔

مجھے مسکراتے دیکھ کر دونوں نے بیک زبان کہا۔ "کیوں بھی کیوں مسکرا رہے ہو؟"

"عتیق میرے یار۔ میں سوچ رہا تھا کہ.... میں اپنی بوتل کی طرف دیکھنے لگا تو دونوں نے

پھر اس بات کا تقاضہ شروع کر دیا کہ میں مسکرانے کی وجہ بتاؤں۔

"تم یہاں ایک خانقاہ کیوں نہیں کھول لیتے، ایک روز گار اور سہی؟"

عتیق فوراً بول اٹھا "سخت لمحہ نہ خیالات ہیں تمہارے۔"

اس پر مجھے اتنے زور کی ہنسی آئی کہ کوک میرے حلق میں اٹک گئی، اور بڑی مشکل سے میں نے

اپنی گردن سہلا سہلا کر اسے حلق کے نیچے فرو کیا۔

وایسی میں سعید نے مجھ سے پوچھا۔ "عقیق تم سے کچھ کہہ رہا تھا۔"
 باہر کے جلوروں سے نظر موڑنے کے وقفے میں اچانک میرے ذہن میں صبح جواب آگیا۔
 "ہاں کہہ رہا تھا سعید نے بہت دیر کر دی، عجیب آدمی ہے، اسے پہلے کہنا چاہئے تھا۔"
 سعید کچھ نہیں بولا۔ فاکس روشنی کے سیلاب میں بہتی جا رہی تھی اور کاریں ہر دو جانب شاہیں
 شاہیں گذرتی جا رہی تھیں۔

لیکن سعید کو عقیق کا جواب بے حد اہانت آمیز محسوس ہوا تھا، چنانچہ اس نے کچھ ایسی باتوں
 کا انکشاف کیا، جو عام حالات میں مجھ سے چھپی رہتیں۔

"عقیق کا جلیبہ تم دیکھتے ہو، مجذوب دکھائی دیتا ہے۔ عالم یہ ہے کہ ابھی تک ہینڈ کلرک بھی
 نہیں ہوا ہے لیکن بچوں کو اس نے اچھی سے اچھی تعلیم دلائی۔ اس کا لونی میں اس کے تین تین مکانات ہیں۔"
 اور یہ کہہ کر سعید بڑی معنی خیز ہنسی ہنسا۔ "یہاں سب کچھ چلتا ہے۔"
 میں کبھی اس کا منہ دیکھتا اور کبھی اپنے آپ میں گم ہو جاتا۔

میں عقیق اور سعید کلرک بھی ایک مثلث بناتے تھے لیکن میں تو اب خیالوں سے پرے ایک خط تھا،
 یوں مثلث تو کب کا ٹوٹ چکا تھا۔ اس کے باوجود عقیق اور سعید آج بھی جگر دی دوست تھے۔

در اصل یہ تصوف کے ایسے ادق مسائل تھے، جو برسوں کی ذہنی ریاضت کے بعد ہی اپنی
 پوری جزئیات کے ساتھ کسی کی گرفت میں آتے ہیں۔

کئی دنوں کے بعد سعید نے مجھے فون کیا کہ عقیق کے یہاں چلنا ہے، وہ مجھے لینے آئے گا۔
 قطار در قطار دو دھیاروشنی کی بارات۔ طوفان بدوش کاریں، ایک عجیب پر اسرار ماحول
 تھا۔ مجھے یہ مناظر بے حد پسند تھے اور میں کافی کافی دیر ان میں کھویا رہتا۔ اس وقت بھی میں ان ہی میں کھویا
 ہوا تھا کہ اچانک میرے دل نے مجھے دستک دی۔ یہ لمحات بڑے قیمتی ہیں۔ یہاں سے لے جانے
 کے لئے تمہارے پاس اور کیا ہوگا۔ بس یہی قیمتی لمحات کہ ان کی بزم آرائیوں سے تمہیں مدد ملے خوش رہنا ہے۔
 'سعید' میں نے سعید کو آواز دی۔

ہی آتا جاتا ہوں۔ کار بہت کم استعمال کرتا ہوں۔“
 عمل چند نے پھر وہی مسکراہٹ بکھرتے ہوئے سوال کیا۔
 ”تو آکاش بامیو، آپ لوگ کیا ہیں اور آپ کا مشن کیا ہے؟“
 انہوں نے نہایت ہی دوستانہ فضا میں بات چیت شروع کر دی تھی۔
 ”میں جی، پی۔ ایچ ڈی ہوں، یہ سی۔ ایچ ڈی ہے، یہ اس۔ ٹی ڈی ہے اور یہ ال۔ اس۔ ڈی ہے۔“

”بہت خوب، بہت خوب۔“
 ”تو گویا آپ پر بھی رعب پڑا ہم لوگوں کی قابلیت کا۔“
 ”اور مشن ہے ہم لوگوں کا سوشلزم کو عمل میں لانا۔“
 انہوں نے نئے سرے سے ایک ایک چہرے کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ وہ بے حد مطمئن دکھائی
 دیتے تھے۔

”دیکھیے آپ تو بڑے مہارِش ہیں، آپ ہم لوگوں کی شادی وادی کی فکر نہ کیجئے۔“
 ”کیوں؟“ انہوں نے مہنسی کو تقریباً روکے ہوئے دریافت کیا۔
 ”کیونکہ ہم ہی تقریباً شادی شدہ لوگ ہیں۔“
 ”یہاں کا اس۔ پی میرا سالا ہے۔“
 ”ڈی۔ اس۔ پی اس کا سسر ہے۔“
 ”علاقے کے انسپکٹر کی لڑکی سے اس کے تعلقات ہیں۔“
 ”اور علاقے کے ہیڈ کانسٹیبل سے اس کا ٹوڈے ٹریفک کارشتہ ہے۔ یعنی وہ اس کا عاشق
 ہے اور یہ اس کی بیٹیا کا۔“
 ”اچھا جی۔“

”ہاں جی اور ہماری سسرال بھی بہت قریب ہے۔“
 ”اور دھرم کرم آپ لوگوں کا۔“

”ہاں کہو۔“

”کچھ نہیں یا کچھ نہیں۔“

لیکن سعید خود ہی بول اٹھا۔ ”علیق کی تجویز کے متعلق اس سے کچھ نہ کہنا۔“

میں نے خاصی بے تعلقی سے ’اچھا‘ کہا اور یوں بیٹھ گیا جیسے مجھے اس بات کا کامل یقین ہو کہ

سعید ابھی کچھ اور بھی کہے گا۔ اور میرا یہ شبہ صحیح ثابت ہوا۔

”یہ کالونی جہاں میں رہتا ہوں، یہاں کی سب سے Post کالونی ہے۔ تمہیں بتاؤ کہ میری بچی

ایک نچلے متوسط طبقے کی کالونی میں جا کر خود کو ایڈجسٹ کر سکے گی۔ کوئی سیچ نہیں ہے یا۔“

”میرا لڑکا فی الوقت دو ہزار تنخواہ پاتا ہے۔ علیق کی لڑکی سے اس کی شادی ہو جاتی تو میں چالیس

پچاس ہزار روپے لگا کر لڑکی کے لئے ایک کلینک کھلوادیتا۔“

”یہاں تو ایک جونیئر لیڈی ڈاکٹر بھی پانچ سات ہزار روپے سے اپنا کیریئر شروع کرتی ہے۔“

”لیکن علیق سوچتا ہے کہ اگر اس کی لڑکی کسی ڈاکٹر سے بیاہی گئی تو دونوں مل کر پندرہ ہزار سے

اڑھائی لاکھ لیں گے۔“ میں خاموشی سے اس کی باتیں سناتا رہا۔

”سخت پھڑے باز ہے یا تمہارا یہ علیق بھی۔“

جی میں آیا، سعید سے پوچھیں کہ وہ خود کیسا ہے؟

لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا کہ عین ممکن تھا کہ میرا یہ دیکارک سن کر سعید

کے اندر سے ان بستیوں کا نیا آدمی برآمد ہوتا اور آگے پیچھے کی ساری روشوں کو روندتا ہوا بڑھ کر گاڑی

رکواتا اور پھر بڑی بے دردی سے مجھے نیچے اتار دیتا۔

اور یہاں تو حد نظر تک پھیلی ہوئی ایک سڑک تھی، جو روشنی کے آبشار میں ننگی مہار ہی تھی۔

شن شن گذرتی کاریں اور ان کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

ایسے میں کہاں جاتا؟ — کیونکر جاتا؟ —

رشتہ

میرا داغ اور میری آنکھیں کام کر رہی ہیں، اور لا تعداد 'شاید' میرے سامنے کھڑے ہیں۔
 اور یہ جو کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہے، ایک بھلا سا آدمی ہے۔ بات بات پر مسکراتا ہے۔ کسی بھی
 معاملے میں الجھنے سے پرہیز کرتا ہے۔ کیسی ہی بحث ہو اسے قدم دو قدم سے آگے بڑھنے سے روک دیتا
 ہے۔ کوئی دو بات کہے، اس کا مذاق اڑائے تو منہس کر مال دیتا ہے۔ سب سے جھک کر ملتا ہے۔
 ظاہر ہے اتنا کہنے کے بعد آپ یہی فیصلہ کریں گے کہ یہ آدمی خاصا مہذب ہے۔
 لیکن ٹھہریے پوری بات سن لیجئے۔ اس آدمی کے اندر ایک اور آدمی بھی بستل ہے، جو اس وقت
 تنگ سر بنوڑھائے اذگھٹتا رہتا ہے، جب تک وہ دارو کے دو چار پونے نہ چڑھالے۔
 دو چار پونے پینے کے بعد اس کے اندر کا مہذب آدمی، اپنا سب کچھ اس آدمی کے سپرد
 کر دیتا ہے، جو بے حد حساس ہے اور جو ساری اذیتوں اور ذلتوں کو پے پے اپنے سینے سے لگالتا
 ہوا انتقامی کاروائیوں پر کمر بستہ ہو جاتا ہے۔
 اس کے بعد وہ مہذب آدمی ایک ٹھنڈی آہ بھر کر سو رہتا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے اندر کا مہذب آدمی محض منافق، بزدل اور مجہول ذہن کا مالک ہے۔ اصل آدمی تو یہ ہے جو حقیقت پسند، راست گو اور دلیر ہے۔

لیکن دوسرا خیال اس سے بالکل ہی مختلف ہے، 'اور وہ یہ ہے کہ یہ ظالم فرد تو محض دارو کے زور پر زندہ ہوتا ہے۔ یہ تو ایک لادی ہوئی شخصیت ہے جو مہذب فرد کی دبی ہوئی، کچلی ہوئی شخصیت کو کچھ دیکھ کے لئے ہانپتی پر چڑھ کر خود غائب ہو جاتی ہے۔ پھر وہ بھلا آدمی، بڑی مشکلوں سے خود کو ہانپتی سے اتار کر بیچ چور ہے پر منہ بسوتا کھڑا ہو جاتا ہے۔

جانے کون سی اس کی اصل شخصیت ہے۔

تو کل کی بات ہے کہ وہ چڑھا کر آیا تو رات ایک پہ گزر چکی تھی، اور میں زمین پر بستر بچا کر لیٹ چکا تھا۔ اس نے انکارے بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے مجھے لٹکارا۔

— "تم ماضی اور روایت سے لپٹے ہوئے کیڑے — تمہارا اپنا کیا ہے؟ — جب بھی تمہیں کسی شے کی ضرورت ہوتی ہے، تم اسے ماضی کے بھندار سے نکال لاتے ہو۔"

— "اور بھنجل میں ہوں۔ میں جس کے آگے صرف حال ہے اور جو اپنی روایت آپ

"قائم کرتا ہے۔"

میں آپ کو بتاؤں، میں بھی بڑا خلیث ہوں، جب مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ ایک بدست ہاتھی پر سوار ہے، اور میں زمین پر نہتا کھڑا ہوں، تو پھر مجھے چپ سادھ لینی چاہئے تھی — دو چار گھنٹے کی قیامت تھی، کیونکہ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ جب وہ سویرے اپنے بہتر نصف کے ساتھ بیدار ہو گا، تو پھیل رات کے رویتے پر ترساف کا انہار کرے گا، اور میرے ہاتھ پاؤں دبا کر مجھے منالے گا۔

لیکن میری شامت ہی سمجھئے کہ میں نے اس کا یہ جواب دیا کہ جو کچھ وہ بول رہا ہے وہ بھی روایت کا ایک حصہ ہے، اور یہ ساری باتیں محض مکرو فریب ہیں۔

اس پر بات بڑھ گئی۔ میں ایک جملہ بولتا تھا، اور وہ پوری پوری تقریر جھاڑ دیتا تھا۔

میں اس کے اس انداز سے واقف تھا، اور اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بولتے بولتے اور ٹول ٹول تقریر کرتے کرتے تنگ جائے گا، تو پھر وہیں لڑاٹک کر سو رہے گا۔

پردات عجیب بات ہوئی۔ اس کا رویہ غیر معمولی طور پر جارحانہ ہوتا گیا اور وہ مجھے ننگی ننگی گالیاں دینے لگا۔

میں نے سخت طیش میں کہا۔ 'چپ بے لوندے' اب کچھ سنا ہے تو گردن توڑ دوں گا۔ اس پر وہ بالکل ہی بے قابو ہو گیا، اور اس نے بڑی سخت گالی دیتے ہوئے کہا۔ 'پھر تجھے اسے بد تیزی کا مزا چکھنا ہوں۔' وہ کوئے میں جا کر کچھ تلاش کرنے لگا، اور پھر وہاں سے ایک چاقو نکال لایا۔ میں اس کی اس حرکت سے ذرا بھی خائف نہیں ہوا، اور یہ سمجھتا رہا کہ اب وہ چاقو کھول کر دوبارہ تقریر شروع کر دے گا، اس طور پر کہ میرا کہا نہیں مانتا تو اس چاقو کا کہا مانا۔ میرا سوچنا کسی حد تک صحیح ثابت ہوا کہ وہ چاقو کھول کر پھر تقریر کرنے لگا۔ لیکن ایک دم سے اس نے نعرہ لگایا۔ 'میں ماضی کو ختم کر دوں گا۔'

اور یہ کہہ کر اس نے بڑی پھرتی سے چاقو میرے سینے میں اتار دیا۔ میں کوئی مزا حمت بھی نہیں کر سکا کہ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ تھوڑی دیر میں چاقو اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گے گا، اور وہ خود اوندھے منہ لیٹ کر لمبی سانس لینے لگا، اور پھر سانس کی آمد و شد نارمل ہونے کے بعد خزانے۔ لیکن یہاں تو کچھ اور ہی ہو گیا۔

چاقو میرے سینے کے اندر چویست ہوا تو میں صرف 'ارے کمبخت' بول سکا، کیونکہ اس کے بعد تو ایسا عسوس ہوا کہ بڑی تیزی کے ساتھ میرے اندر کا سب کچھ باہر نکلتا جا رہا ہے۔ بل بل کرتا ہوا۔

یوں لگا کہ کسی منہ زور دریا کا بندھ ٹوٹ گیا ہو اور اب سرکش موجیں ہیں اور میں ہوں۔ میں گھٹنوں تک ڈوب گیا۔ کمر تک۔ سینے تک۔ گردن تک۔ ستر تک۔

میں نے اس سیلاب سے نکلنے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے، لیکن میری ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔

تب ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سفید گھوڑے پر سفید جاموں میں ملبوس ایک شہ سوار فضاؤں سے اتر کر میرے قریب آیا، اور تیزی سے کسی رسی شے کو جو دیکھی نہیں جاسکتی تھی، ایک سفید کپڑے میں لپیٹے لگا۔

اور وہ شہ سوار کہ فرشتہ اجل تھا، جب میرا سب کچھ لے کر لوٹنا چاہتا تھا، تو میں نے گرگڑا کر اس سے درخواست کی کہ وہ میری بصارت اور میرا دماغ اُس وقت تک میرے پاس رہنے دے، جب تک کہ یہ شخص میری لاش کو ٹھکانے نہ لگا دے۔

وہ میری بات مان گیا، اور میرا سب کچھ بجز میرے دماغ اور میری آنکھوں کے لے کر لوٹ گیا۔ میں انجانی منزلوں کی طرف گم ہوتا جا رہا تھا۔ میں وہاں ایک لاش بنا پڑا تھا۔

ایک شانے کے بعد میں نے دیکھا کہ اس نے چاقو میرے سینے سے نکال پھینک دیا۔
”سو جا سارے لمبی تان کر۔“

اور یہ کہہ کر وہ خود بھی میرے قریب ہی دراز ہو گیا۔

میں نے غلط کہا، یہ جملہ میں سن نہیں پایا، کیونکہ میری سماعت تو ختم ہو چکی تھی۔ بس اندازہ ہے کہ وہ یہی بولا ہوگا۔

وہ جانے کب تک سوتا رہا۔

میں ایک تیزی سے جتے ہوئے لہو کے سیلاب کے درمیان جزیرہ بنا پڑا تھا، یہ اس عالم کہ فرشتہ اجل کی عنایت خاص سے ابھی میرا دماغ اور میری بصارت کام کر رہی تھی۔

ایک زمانہ گزر گیا — میں نے پھر غلط کہا، رات گزر گئی۔ وہ جاہلیاں لیتا ہوا اٹھا اور اس نے غالباً مجھے آواز دی۔ ہر صبح وہ مجھے اسی طرح آواز دیا کرتا تھا۔

”میرے باپ تم کہاں ہو؟“

اور تب مجھے اس عالم میں دیکھنے کے بعد وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ وہ سینہ بھار کر رونا چاہتا ہوگا یا شاید رویا بھی ہو۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا...

شاید سینہ پھاڑ کر رونا خلاف مصلحت ہو، یوں کہ اس فحاشی کے رخصت ہونے کے بعد یقینی عقل اس کی پاس بان ہو گئی ہوگی۔

اس نے جلدی جلدی کہیں سے ایک پٹی قمیض نکالی، اسے اچھی طرح بھگویا، اور بڑے احتیاط سے میرے ارد گرد کے خون کو صاف کیا۔ یہ کرنے کے بعد اس نے میری قمیض اور میرا تہ بند اُتار دیا۔ سارے جسم پر خون کے دھبے تھے، انہیں پونچھا اور جب وہ سینے کا زخم صاف کر دیا تھا تو کہیں سے تازہ خون کے چند قطرے نکل آئے۔

یہ سارے کام کمال مستعدی سے انجام دینے کے بعد اس نے مجھے ایک دھلی ہوئی قمیض اور تہ بند پہنا دیا۔ پھر میری لاش کو اپنے بستر پر ڈال کر، اس نے میرے بستر کو کہ جس پر جا بجا خون کے دھبے تھے، لپیٹ کر ایک کونے میں چھپا دیا۔

تب اُس نے مجھے ایک چادر اور مٹا دی اور چاہا کہ میری آنکھیں بند کر دے لیکن ایسا ممکن نہیں تھا کہ فرشتہ اجل سے میرا ایک معاہدہ تھا۔

اس نے اپنی جیب کی تلاشی لی تو کچھیلی رات کی بچی ہوئی کچھ نقدی برآمد ہوئی، جو یقیناً اس موقع کے لئے بے حد نا کافی تھی۔ تب ہی وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

وہ روز کنوئیں میں ڈول ڈالتا اور جو کچھ اس میں آتا، اس سے اپنی درودقت کی رفتی اور پوتے کا انتظام کر لیتا۔ ان حالات میں اس کی جیب سے چند ایک سکوں کا نکل آنا بھی کمال تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ایک بار دل کھول کر رونا چاہتا ہوگا۔

اپنی بے بسی پر —

میری موت پر —

لیکن ایسا کرنا غلط ہوتا کہ میں صرف اس کا ساتھی نہیں، اس کا مقتول بھی تھا، اور اسے دنیا کو یہ باور کرانا تھا کہ میں فطری موت مرا ہوں۔

شاید وہ چپکے چپکے آس پاس کے کچھ سیدھے سادھے لوگوں کو بلا کر میرا کفن دفن کر دے، زیادہ ہنگامہ اس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ وہ یہیں گڈ بٹھا کھو کر اس میں میری لاش دفن کر دے۔

لیکن ایک مختصر سے کمرے کی بساط ہی کیا؟

پھر کچے فرش کا سینہ توڑنے کے لئے کدال کہاں سے لائے گا؟

فرش کو توڑنے سے جو شور اٹھے گا اُسے کس طرح دبائے گا؟

یہ بھی ممکن ہے کہ وہ میری لاش کو کسی ٹرنک میں رکھ کر اُسے کسی ٹرین کے ڈبے میں چھوڑ آئے۔

لیکن اتنا بڑا ٹرنک کہاں سے لائے گا؟

اس میں کافی خرچ کے امکانات ہیں، اور وہ تو جیسا کہ میں نے ابھی کہا روز مزدوری پانے

والا فرد ہے۔

اُسے پیشگی کون دے گا؟

اور پھر اس طرح شک و شبہ کا ایک دفتر بھی کھل سکتا ہے۔ یہ بڑا نازک مقام ہے کہ

میں ایک مقتول ہوں، لیکن وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ میں فطری موت مرا ہوں۔

تو کیا وہ میرے کفن دفن کے لئے چندہ اکٹھا کرے گا؟

لیکن وہ تو اسی حالت میں ممکن ہے کہ وہ میری موت کو فطری موت ثابت کرنے میں

کامیاب ہو جائے۔

اور اگر وہ اس میں کامیاب بھی ہو گیا اور اس نے پیسے بھی جمع کر لئے، تو کیا وہ

شام ڈھلے اُن کی پی نہیں جائے گا؟

لیکن گھیسو تو میں ہوں، یہ کام وہ میرے بغیر کیسے کر سکتا ہے؟

یہ اور اسی نوع کے سیکڑوں سوال میرے دماغ میں گشت کر رہے ہیں۔

اور میں سمجھتا ہوں کہ سیکڑوں سوال اُس کے آگے بھی سر اٹھائے کھڑے ہوں گے۔

۱۹۷۹ء

— ❖ —

سہ گھیسو، پریم چند کے 'کفن' کا ایک کردار

آنے والا

”چونکہ اس قصبے میں یہ مکان سڑک سے قریب تر نظر آیا، اس لئے مجھے یہ خیال آیا کہ رات یہیں گزاری جائے۔“

”اگر آپ ٹھہرنے کی اجازت دے دیں تو“

گھر میں دو میاں بیوی، ایک لڑکا اور ایک بوڑھی عورت رہتی تھی۔

مرد نے لہک کر جواب دیا۔ ”ہاں ہاں بھائی صاحب، گھر آپ کا ہے، بیشک قیام کریں۔“ لیکن اس کی بیوی کی آنکھیں غیر متحرک رہیں۔ اس کے چہرے پر بھی کوئی تاثر نہیں تھا اور نہ ہی اس نے رضامندی کے اظہار میں شہسہ کا ساتھ دیا۔ وہ خاموش خاموش ہی آنے والے کو دیکھتی رہی، جو گاڑھے کی قمیض اور پانچمے میں بلبوس تھا، اور جس نے اپنے کاندھے پر ایک قبیلہ لٹکا رکھا تھا۔ آنے والے نے شکریہ ادا کیا اور ٹھنڈی سانس لے کر بیٹھ گیا۔

اس پر میزبان نے کہا۔ ”غسل خانے میں پانی رکھا ہے، آپ منہ ہاتھ دھولیں۔“

تب اس نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دوسری بار اس کا شکریہ ادا کیا۔

منہ ہاتھ دھو کر وہ دونوں اسی جگہ آنے سے سامنے بیٹھ گئے۔

”کہاں سے آرہے ہیں؟“

آنے والے نے کہا: ”پورب سے آ رہا ہوں اور پچھم کی سمت جا رہا ہوں۔“

ایسا کھڑا کھڑا جواب سن کر جس میں ٹالنے کا انداز نمایاں تھا، مرد کو کسی قدر مایوسی ہوئی،

لیکن پھر اس کے دل نے اُسے سمجھایا: ”نکمن ہے اس نے ٹھیک ہی کہا ہو۔ ایسے جہانیاں جہاں گشت لوگ بھی ہوتے ہیں، جن کا نہ کوئی گھر بار ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی منزل ہوتی ہے۔“

اُسی لمحے اس کی بیوی نے باورچی خانے سے آواز دی۔

وہ گیا تو بیوی نے کہا: ”آپ بلا سوچے سمجھے جسے چاہتے ہیں بٹھا لیتے ہیں۔“

اُس نے سرگوشی کے انداز میں کہا تھا، لیکن شوہر شاید اس سے بھی زیادہ محتاط تھا، چنانچہ

اُس نے شہادت کی انگلی اپنے ہونٹوں کے درمیان رکھ کر کہا۔

”آہستہ بولو سن لے گا، تو کیا کہے گا۔“

تب صرٹ ہونٹوں کو جنبش دیتے ہوئے عورت بولی۔

”کیسی تشویشناک باتیں کرتا ہے، نہ گھر بار ہے نہ کوئی منزل۔ پھر یہاں کیا لینے

آیا ہے۔“

’لینے آیا ہے‘۔ پر مرد بھی ایک لمحے کے لئے فکر میں ڈوب گیا۔

— گھر میں بیوی کے زیورات ہیں، کچھ نقدی ہے، کپڑے لے، برتن باسن۔ یہ

جیزیں گھر میں ہیں تو ان کی قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا، بازار میں جاؤ تو بہتہ چلتا ہے۔

لیکن اس نے دوسرے ہی لمحے اس شبہ کو ذہن سے جھٹک دیا۔

— ارے اکیلا آدمی کیا کر لے گا، اور پھر یہ تو سیدھا سادھا دکھائی دیتا ہے۔ بیوی تو

خواہ مخواہ

اور یہ سوچ کر اس نے بیوی کے شبہ کو یک قلم رد کر دیا۔

”شبہ بعد میں کر لینا، پہلے اس کے کھانے پینے کا انتظام کرو۔“

مسافر کے لئے کھانا لگاتے ہوئے اس نے کہا۔

”ہم لوگ سرشام ہی کھانے کے عادی ہیں، اسی لئے آپ کو اکیلے ہی کھانا ہوگا۔“
اس نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں ہے۔“ اور اللہ کا نام لے کر کھانے پر بیٹھ گیا۔

دو ایک روٹیاں اس کے پیٹ میں اتریں تو کھانے میں اس کا انہماک کسی قدر کم ہوا، اور اس نے میزبان کو نظر اٹھا کر دیکھا۔

”آپ کا مکان آرام دہ ہے۔“

اس نے ’جی‘ کہہ کر گویا اس کا شکریہ ادا کیا۔

اچانک مرد کو کچھ یاد آگیا۔

”معاف کیجئے گا، میں نے اب تک اپنے یہاں کا نام نہیں دریافت کیا۔“

”مسافر ہی کہہ لیجئے، کیونکہ دیکھئے نا آج کی رات میں آپ کا مہمان ہوں، کل کسی اور کا مہمان رہوں گا، پرسوں کسی اور کا، اور نرسوں ایسا شخص کسی کا مہمان نہیں ہوتا، اسے تو ’مسافر‘ ہی کہئے کہ سفر ہی اس کی پہچان ہے۔“

بیوی کے کان کھڑے ہوئے۔ نہ نام بتاتا ہے، نہ اتہ پتہ۔

مرد کے چہرے پر ایک ساعت کے لئے ایک ناگوار سا تاثر پیدا ہوا، لیکن دوسری ہی ساعت اس نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا کہ۔

— ایسے آدمی کی باتوں کا کیا بُرا ماننا، جو آج یہاں بے کل کہیں اہ ہوگا، پرسوں کہیں اور۔ ہم جتنے ہوئے پانی کی چال دیکھ سکتے ہیں، اس کی گنگناہٹ سن سکتے ہیں، لیکن اس کا نام، اتہ پتہ اور اس کی منزل تو نہیں پوچھ سکتے اور نہ ہی اس سے کوئی معاملہ کر سکتے ہیں۔ تو یہ آدمی بھی تو بہت پانی ہے۔

کھانے کے بعد وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔

اتنے میں مرد کو یہ احساس ہوا کہ رات زیادہ ہو گئی ہے معاً اس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

”یہ تو اپردہ والا ہی جانتا ہے کہ ہم لوگ تو ڈائریکٹ آکاش سے اُتارے گئے ہیں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لئے میرے گلے میں سونے کی چین ہے، مگر میں ہندو نہیں ہوں۔ اس کے سر پر انوکھا کپڑا ہے لیکن یہ مسلمان نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ میں کلا ہے مگر یہ سکھ نہیں ہے لہذا اس نے صلیب لٹکا رکھی ہے مگر عیسائی نہیں ہے۔“

”بہت خوب بہت خوب توینگ بوائز میں اب اجازت چاہوں گا۔“

لو جی ہو گیا بیڑا ہی غرک۔ ٹھنڈی شرک

(وہ ق سے مجبور تھا)

’اے تو گاتا کیوں نہیں‘

’اسی نہ جاؤ چھوڑ کے کہ دلی ابھی بھرا نہیں‘

’سارے کسری سے مذاق کرتا ہے‘

”بات یہ ہے شریان جی کہ آپ کو تو معلوم ہی ہو گیا کہ ہم لوگ ایک خاص مشن لے کر آئے ہیں۔

یہی دیکھئے کہ میں پھیرا ہوں اور ہنسی لئے مچھلیوں کی سلاہکتا ہوں۔ یہ مرغ مرغیوں کا گانا بولتا ہے اور

اور ہر صبح ایک نئے مرغ کا انتظار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ہمارا جدو شینت ہے، ہرن کی آنکھوں کا پرپی

یہ ہر آن کسی بھاگتے ہرن کو دام میں لانے کی ٹکڑیوں کا ڈبہ بنتا ہے۔ یہ چرواہا ہے بچے بکریاں پالتا ہے اور یہاں بیٹھا قد آور

بکروں کی جلدائی میں گھٹا رہتا ہے۔ لیکن آج صبح سے ہم سب بیکار ہیں اور ہماری کوششیں ہر طرح اکارت جلدی

”تو پھر حکم دیجئے۔“ محل چند نے اسی خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

”معمولی سی بات ہے جی۔ آپ ہماری کوششیں کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالئے بس آپ سے یہی

درخواست ہے۔“

”نہیں جی تو بہ کیجئے میں تو خود دل سے شلست ہوں۔“

”واہ، واہ، واہ۔“

”محل چند جی زندہ باد۔“

”تو پھر جناب عالی آپ خود ہی سب کچھ قومی بینک کے حوالے کر دیں۔“

”اجنبائی صاحب اب آپ آرام کریں۔“

”بالکل صحیح کہا آپ نے۔ میں بھی تھکا ہوا ہوں، اور آپ کے بھی آرام کا وقت ہو گیا ہے۔“

مسافر کا بستر بچانے کے بعد، مرد نے ایک صراحی اور گلاس لا کر رکھ دیا، اور تب اُسے

’شب بخیر‘ کہہ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

مسافر نے کمرہ اندر سے بند کر لیا تو عورت چپکے سے بولی۔

”اس نے کمرہ اندر سے بند کر لیا ہے، آپ باہر سے بند کر دیں۔“

مرد نے کہا۔ ”تم ہوش میں ہو؟ — ہو سکتا ہے وہ رات کے کسی لمحے پیشاب کے لئے

اٹھے، اور پھر یہ انسانیت سے گری ہوئی بات ہے کہ ہم اپنے مہمان کے ساتھ ایسا سلوک کریں۔“

آٹھ دس سال کا لڑکا جو ان کے پلنگ سے ملے ہوئے پلنگ پر سو رہا تھا، اچانک سوتے سوتے

اٹھا، اور جب اُس نے دیکھا کہ اس کے ماں باپ دیہیے سروں میں کچھ تیز تیز گفتگو کر رہے ہیں،

تو اس نے ماں سے پوچھا۔

’کیا ہوا ماں‘

ماں نے کہا، ’کچھ نہیں تم سو جاؤ۔‘

یہ کہہ کر عورت بھی لیٹ رہی، لیکن یکدم سے اسے کچھ یاد آگیا اور وہ ہڑبکا کر اٹھ بیٹھی۔

’بتہ نہیں کون ہے؟ — نہ نام، نہ گھر، نہ کوئی منزل — مجھے تو اٹھائی گیارہ گھنٹے — ہر

کام بلا سوچے سمجھے کرنے ہیں۔ مجھ سے پوچھ تو لیا ہوتا۔“

مرد نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”کچھ نہیں ہو گا خدا پر بھروسہ رکھو۔ مجھے تو سیدھا سا دھما

آدمی دکھائی دیتا ہے۔

اس پر بیوی نے کہا۔ ”ایسے لوگ تو اندر بھی خطرناک ہوتے ہیں۔“

مرد پہلو بدل کر لیٹ رہا۔ مقنوسی دیر بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔

لیکن عورت سیدھی لیٹی چھت کو تکتی رہی۔ جب بھی اس پر نیند کا غلبہ طاری ہوتا، وہ اٹھ

بیٹھتی، اور جہاں ذرا سی آہٹ ہوتی تو وہ مرد کے بازو کو اپنی گرفت میں لے لیتی تاکہ اگر واقعی کوئی بات

ہو تو اُسے جگا دے۔

تھوڑی دیر بعد مسافر کے خزانے سنائی دینے لگے۔

عورت زیر لب بڑبڑاتی — ”یہ سب اس لئے کر رہا ہے کہ ہم لوگ بے فکر ہو کر سو رہیں۔

بڑا ہوشیار لگتا ہے۔“

اس کے بار بار بڑبڑانے سے مرد کی آنکھ کھل گئی اور اس نے آہستہ سے کہا — ”آخر سوتی کیوں نہیں ہو؟ — امان دالان میں لیٹی ہیں، اگر خدا نخواستہ کچھ ہوا تو وہ ہمیں آواز دے دیگی۔“

عورت نے بگڑ کر کہا — ”ہونہ ماں کس کام کی ہیں۔ ہمیشہ پان تبا کو کے نشے میں پڑی رہتی ہیں، وہ سب کچھ صاف کر جائے گا اور انہیں جتن تک نہ ہوگی۔“ اس کا لہجہ خاصا حقارت آمیز تھا۔

اتنے میں بوڑھی عورت کھانسی ہوئی اٹھ بیٹھی، اور اس نے تیز تیز ہچے میں ان کی سرگوشیاں

سُن لیں۔

اور تب گویا اس نے انہیں اپنے وجود کا احساس دلاتے ہوئے زور سے ہانک لگائی۔

”تم لوگ ابھی سوئے نہیں ہو۔“

عورت نے کہا — ”لو ہو گئی چھٹی، اب یہ پورے گھر کو اپنے سر پر اٹھالیں گی۔“

اس پر مرد، دبے پاؤں بوڑھی عورت کے پاس گیا، اور اس نے اس کے کان کے پاس جا کر

کہا ”اماں آہستہ بولو، گھر میں مہمان ہیں کیا کہیں گے۔“

’اچھا۔ اچھا۔ کہہ کر اُس نے پاندان کھول کر ایک پان بنایا، اور تبا کو ڈال کر اپنے منہ میں

دبالیہا۔ اس کے بعد پھر اپنی پلنگی پر دراز ہو گئی۔

مرد بھی اپنے پلنگ پر آکر لیٹ رہا۔

”آخر تمہارا ارادہ کیا ہے، مرد نے دیر سے سوال کیا۔

عورت پھر چپکے چپکے بڑبڑانے لگی۔

”آپ کو کیا ہے، آپ اطمینان سے سوتے رہئے۔ یہاں تو ایک پیالہ بھی چوری ہو جائے تو

لگتا ہے ایک قیمتی چیز چوری ہو گئی۔ میں نہ ہوتی تو خاک اڑا کرتی گھر میں۔ آپ تو ہر ایرے غیرے

نعمتِ خیرے کو بلا کر بٹھرا لیتے، جو صبح تک گھر کو چائی ہوئی رکابی کی طرح صاف کر جاتا۔

مرد نے کہاں۔ ”ہاں اسے تو ساری دنیا تسلیم کرتی ہے۔“

عورت بولی ”کرتی ہی ہے۔ ایک آپ کے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔“

مرد پھر کوٹ لے کر لیٹ رہا۔

عورت اگر دو چار ثانیوں کے لئے لیٹ بھی جاتی تو مسافر کے خزانوں کے اچانک ٹوٹ جانے سے وہ پھر چونکا ہو جاتی، یہاں تک کہ مسافر پھر نئے سرے سے خزانوں کے راگ الاپنے لگتا۔

آدھی رات کے بعد عورت کو ایسا محسوس ہوا کہ مسافر اپنے کمرے کا دروازہ کھول رہا ہے۔ اس نے شوہر کے بازو کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا۔

باہر نکل کر مسافر نے لوٹے میں پانی لیا اور پانچلے کی طرف چل دیا۔ عورت سہمی سہمی پانچلے کی طرف دیکھتی رہی۔

ستھوڑی دیر بعد وہ آنگن میں کھڑا آسمان کی طرف نظر دوڑا رہا تھا جہاں تاروں کی محفل گرم نئی اس طرح وقت کا اندازہ لگانے کے بعد وہ پھر اپنے کمرے میں چلا گیا اور اسے اندر سے بند کر لیا۔

عورت نے سوچا کافی چالاک دکھائی دیتا ہے، اسے شاید اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ میں جاگ رہی ہوں۔

وہ پھر دو چار ثانیوں کے بعد خزانے لینے لگا۔

معاً عورت کو خیال آیا کہ کہیں اس کے پتیلے میں کوئی ہتھیار نہ ہو۔ پھرا، چاقو، پستول۔ اور یہ سوچ کر اسے لہزہ سا طاری ہو گیا۔ اگر ایسا ہوا تو ہم لوگ کیا کر لیں گے، یہاں تو گھر میں ایک چھڑی بھی نہیں نکلے گی۔

تب ہی اس کے دل میں شوہر کے لئے، غصے کی ایک نئی ہلر دوڑ گئی۔

کیسی بے فکری سے سوئے ہیں، یہ بھی نہیں ہوا کہ کم از کم اس کے پتیلے ہی کی جانچ

پڑتا ل کر لیتے مجھے اپنی جان کی پردہ نہیں، لیکن خدا نخواستہ میرے بچے کو کچھ.....

اس مقام پر پہنچ کر اس نے شوہر کو ہلکی سی ہتکی دی۔

”سنئے آپ نے اس کا فیصلہ دیکھ لیا تھا؟“

مرد جو اپنی بیوی کے بار بار اٹھنے بیٹھنے سے چین کی نیند نہیں سو سکا تھا، جھنجھلا کر اٹھا۔ کچھ دیر تک وہ اپنی ران کھلاتا رہا، پھر جھلکا کر بولا — ”کیا بد تمیزی ہے“۔ ساری رات تم نے سونے نہیں دیا، اب کیا ہوا؟“

عورت نے وہی سوال دہرایا۔

”ہاں بہت سارے مہلک ہتھیار اس نے اپنے فیصلے میں بھر رکھے تھے۔ چاقو، چھرا، پستول، بم“۔
”ہو نہ دماغ خراب ہے“

عورت روہانسی سی ہو گئی اور اس نے چپکے سے کہا —
”آپ کا کیا بگڑے گا“

اس پر مرد نے بگڑ کر کہا — ”اچھا اچھا سن لیا، اب نہ اٹھانا“ — اور یہ کہہ کر وہ پھر سے سونے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔

عورت نے دل میں سوچا — اچھا ہے پہلے پاں تبا کو والی بڑی بی کو صاف کرے گا —
اپنی اماں جائیں گے تو پتہ چلے گا۔

وہ اسی طرح اٹھتی بیٹھتی رہی۔ بار بار اس کے ذہن میں لہریں بیدار ہوتیں۔

— کیا آدمی ہیں کوئی دوسرا ہوتا تو گھر کو بنانے کی فکر کرتا۔ ایک یہ ہیں کہ پتہ نہیں رکن
لغنگوں کو گھر پر ٹھہرا لیتے ہیں۔ ذرا سوچنے کی بات ہے، نہ گھر کا پتہ بتاتا ہے، نہ منزل کا اور نہ ہی اپنا
نام، اور اس پر آکر پڑ رہا — اور اس عالم میں بھی انہیں اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا، حالانکہ
مسمولی سمجھ بوجھ والا آدمی بھی کہہ دے گا کہ اس میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ آخر یہ گہری راز داری کیوں؟ —

.....
دنیا کا قاعدہ ہے کہ لوگ آتے ہیں، اپنا نام بتاتے ہیں، اتہ پتہ بتاتے
ہیں، اپنا کام بتاتے ہیں — تب کہیں جا کر انہیں ٹھہرنے کی اجازت دی جاتی ہے — مگر یہاں

تو بلا سوچے کچھ ٹھہرایا جاتا ہے۔ پہاڑ جیسا جسم رکھتے ہیں، لیکن عقل چھوٹی نہیں گئی ہے۔
 مرد دوسری طرف کروٹ لیئے سو رہا تھا۔ لڑکا بھی بے خبر تھا۔ بڑی بی وقفے وقفے پر اٹھ کر
 ایک نیا پان بناتیں اور تبا کو ڈال کر اسے اپنے منہ میں دبالتیں۔ دوسرے کمرے میں مسافر کے
 خزانے لینے کی آواز بلند ہو رہی تھی، ہاں کبھی کبھی خزانے کی آواز اس طرح بدلنے لگتی کہ معلوم ہوتا گاڑی
 چلتے چلتے دوسری پٹری پر سوار ہو گئی ہے۔

— ہونٹھ فکر کرنے کے لئے ایک میں ہی رہ گئی ہوں۔ ایک یہ اماں ہیں کہ سوائے اپنے
 پان تبا کو کے انہیں کسی چیز کی فکر نہیں۔ ایک یہ ہیں کہ انہوں نے تو شاید قسم کھا رکھی ہے کہ گھر کی بات
 میں مجھ سے مشورہ نہیں لیں گے، حالانکہ ان کی اس حرکت سے ہمیشہ نقصان پہنچا ہے۔

— ابھی بری کی فکر ہو تو مجھے ہو۔ یہ تو بے فکر آدمی ہیں۔ ان سے اچھا تو یہ
 چھوٹا سا لڑکا ہے۔ اگر یہ جاگتا رہتا تو اس لفٹ کے سب کچھ معلوم کر لیتا بلکہ اس کے تیلیے کی تلاشی
 بھی لے لیتا۔ ایک یہ ہیں کہ وہ فلسفہ بگھاتا رہا اور یہ چپ چاپ بیٹھے سنتے رہے۔

اتنے میں کچن سے کسی برتن کے گرنے کی آواز آئی۔ عورت سہم گئی اور اس نے باہر کی طرف
 جھانکا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ چوہے نے گرایا ہو گا۔

اسی دوران اس نے ایک نظر میں سب کچھ دیکھ لیا۔ الماری اور کمبوس میں نالے لگے تھے۔
 ہر طرف سے اطمینان کرنے کے بعد وہ اپنے یلنگ پر آ بیٹھی۔

اب اسے جامیاں آنے لگی تھیں۔ آنکھیں جل رہی تھیں اور سر بھرا بھرا سا محسوس ہو رہا تھا۔
 تب ہی مندر سے گھنٹے کی صدا ابھری۔ عورت نے سوچا۔ چلو اب سویرا ہو رہا ہے۔
 پھر کچھ ہی دیر میں مسجد سے فجر کی اذان ہونے لگی تو عورت نے آنچلی سر پر رکھ لیا۔

— ان کی حرکت سے میں رات بھر سو نہیں سکی۔ کسی کی طرف سے جب تک پورا
 اطمینان نہ ہو جائے، اسے ٹھہرنا کتنی خطرناک بات ہے۔ زمانہ ایسا محدود ہے کہ کسی پر بھروسہ نہیں
 کیا جاسکتا۔ لیکن انہیں تو بس ٹھہرنے سے کام ہے۔ سوچنا سمجھنا تو ان کی سرشت ہی میں نہیں ہے۔

اتنے میں مسافر کے کمرے سے چلنے پھرنے کی آواز اُبھرنے لگی۔

کمرہ کھول کر وہ باہر نکلا۔ اس نے ایک زوردار انگڑائی لی اور ہاتھ روم کی طرف چلا گیا۔

عورت اپنے پلنگ پر بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھی، اور وقت تھا کہ اندھیرے اور اُجالے کی

سرحدوں کے درمیان کا ایک سسناں سفر طے کر رہا تھا۔

مسافر نے ہاتھ منھ دھونے کے بعد آواز بلند کی۔

”بھائی صاحب“

اور جب مرزا آنکھیں ملتا ہوا اس کے پاس پہنچا تو اس نے کہا۔

”آپ نے رات کا کھانا کھلایا، سونے کی جگہ دی، خدا آپ کا بھلا کرے۔“

”اب میں جا رہا ہوں، آپ اپنا کمرہ دیکھ لیں۔“

مسافر کی آنکھیں صبح کے اُجالے کی طرح صاف ستھری تھیں، لیکن عورت کی آنکھیں

بلب ایک گذرگاہ کا

ایک طرف گلی کوئی چالیس پچاس گز کا سفر طے کرنے کے بعد ایک نسبتاً کشادہ سی گلی میں جا ملتی تھی تو دوسری طرف ساٹھ ستر گز کے فاصلے کے بعد میونسپل کارپوریشن کے سیمپ پوسٹ سے دو چار قدم پرے اس گلی سے کئی ایک گلیاں پھوٹی تھیں۔

اور جس مقام کا یہ ذکر ہے وہاں رات کو ایسا گہرا اندھیرا چھا جاتا تھا کہ آنے جانے والے کبھی ایک کچے گھر کے آگے بنے چہرے میں گر جاتے، اور کبھی بہت احتیاط سے چلنے کے باوجود اس عقرب نما گڑھے میں پاؤں ڈال دیتے، جس میں نالی کا زائد بانی ہمہ وقت جمارتا۔ اس عقرب نما گڑھے کو گلی کے لڑکے بھیل کہا کرتے اور اکثر جھوٹے بچے کھیلتے کھیلتے اس میں کاغذ کی ناؤ چھوڑ دیتے۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ ایک عورت کی چیل اس گدے پانی میں چلی گئی تو اس نے زور زور سے دہائی دی کہ کوئی اللہ کا بندہ اُسے روشنی دکھاتا۔

قریب ترین گھر کا مالک کہ خدا ترس آدمی تھا، اس کی آواز سن کر مارچ لے گھر سے باہر نکلا۔

ٹماچ کی روشنی میں عورت نے اپنی چیل برآمد کی، اور پھر اس کے گھر میں جا کر اپنے پاؤں دھوئے، چیل دھوئی اور یوں اسے دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہو گئی۔

اس واقعہ کا اس شخص پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے دوسرے ہی دن اپنی دیوار میں پھید کر کے گلی کی سمت سجلی کاتار اور ہولڈر لگایا اور اس میں ایک بلب فٹ کر دیا۔

کچھ دنوں تک وہ بلب — روشن بلب راتوں میں خیر جاریہ بنا رہا۔ گلی میں آنے جانے والے ادبڑ کھاڑا راتے، نالی، چہ بچہ اور عقرب نا جمیل کے گدلے پانی سے محفوظ رہے۔ اس طرح گلی کے باسیوں اور دوسرے راہگیروں نے سکھ چین کی سانس لی۔

لیکن ایک دن شام ڈھلے جب اس نے گلی کے بلب کا سوچ آن کیا تو اسے یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ گلی میں روشنی کا کوئی کوندا نہیں لپکا۔

وہ تقریباً دوڑتا ہوا گھر سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ ہولڈر کی گردن سے بلب غائب تھا۔ اسے یہ سوچ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اتنی معمولی سی چیز کون چرالے گیا، لیکن دوسری ہی ساعت اسے خیال آیا کہ ممکن ہے بلب ہولڈر میں پوری طرح فٹ نہ ہوا ہو، اور دن کے کسی اوقات میں نیچے گر کر ٹوٹ گیا ہو۔

اُس نے نیچے جھبک کے دیکھا لیکن پھر اپنی نادانی پر خود ہی پشیمان ہوا اٹھا کہ بلب کے بیشتر اجزاء کو تو آنے جانے والوں کے قدم کب کے روند چکے ہوں گے، ممکن ہے کچھ اجزاء نالی میں بہہ گئے ہوں۔ پھر وہ آخر وہاں کیا ڈھونڈ رہا ہے۔

وہ اس خیال کے آتے ہی انگنائی کا وہ بلب جو ایک فاضل بلب کی حیثیت رکھتا تھا، نکال لایا اور اسے اس نے ہولڈر میں فٹ کر دیا۔

کسی راہگیر کے استفسار پر جب اس نے بتایا کہ پہلا بلب غالباً گر کر ٹوٹ چکا ہے اور اب وہ دوسرا لگا رہا ہے تو راہگیر نے اس پر ایک تشریفی جملہ اُچھال دیا۔

”بھائی صاحب نیکی کی راہ میں بھی آج کل بڑے جھیلے ہیں۔“

مکان کا مالک آہستہ سے سر ہلکا کر اظہار تشکر بجا لایا اور یوں گلی میں ایک دوسرے بلب کی

روشنی کا دور شروع ہو گیا۔

چلتے چلتے مالک مکان نے بلب کی ہر دو کیل کو اچھی طرح دیکھ لیا، جو ہولڈر کے خانوں میں پوری طرح پیوست تھیں۔ اتنا کچھ دیکھنے بھالنے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ بلب اب گرنے والا نہیں ہے۔
لوگ راتوں میں بلا خوف و خطر گلی میں آنے جلنے لگے۔ روشنی چونکہ روشنی تھی، اس لئے وہ اپنا حصار توڑ کر خاصی دور تک چلی جاتی، اور دونوں رخ کا بڑا علاقہ اپنے قبضے میں لے لیتی۔
آس پاس کے لوگ خوش تھے کہ اس مقام پر بلب لگ جانے سے رات کے وقت گلی کی راہ طے کرنے میں بڑا آرام ہو گیا، ورنہ بلب لگنے سے پہلے آئے دن کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا حادثہ ہوتا، سی رہتا تھا۔

مالک مکان بھی کہ جس نے اپنی دیوار پر بلب آدینا کیا تھا، اب بے حد خوش تھا کہ اس کے ایک جھٹے سے ایسا نرے خلق خدا کو آرام ملا اور ایک عرصے سے کوئی واردات سننے میں نہیں آئی۔
اسی دوران بلب ایک بار پھر غائب ہو گیا۔ بلب والے شخص نے سوچا، اس بار تو بلب کے گرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا کیونکہ اس نے اچھی طرح سے بلب کی کیلوں کو چیک کر لیا تھا۔ اس بار تو یقینی بلب چوری گیا ہے۔

یہ سوچ کر وہ اڑوس پڑوس کے لوگوں کے پاس گیا کہ شاید انہیں بلب کا کچھ علم ہو — شاید انہوں نے کسی کو چراتے ہوئے دیکھا ہو، لیکن سبوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

ظاہر ہے چور اتنا دیدہ دلیر تو تھا نہیں کہ محلے والوں کے سامنے سینہ تان کر بلب کی چوری کرتا۔
چوری تو اس نے بہر حال رات کے سناٹے ہی میں کی ہوگی۔

تب پڑوسیوں نے اس گلی میں کھڑے کھڑے ایک غیر رسمی سی ملاقات کی اور صورت حال پر غور و خوض کیا۔

دفتر کے ایک بابو کا خیال تھا کہ ’سل‘ — وہ پورا نام لینا چاہتے تھے کہ ایک صاحب نے اپنے منہ پر شہادت کی انگلی رکھ کر انہیں رد کر دیا۔

”بھائی صاحب صرف نام کا پہلا حرف استعمال کیجئے۔ محلے کے سبھی لچے لفٹے، لونڈے پارٹی

تو اپنی نظریں ہیں، پھر کیا ضروری ہے کہ ہم کسی کا نام لے کر اس سے دشمنی مول لیں۔
 کسی نے تجویز پیش کی کہ اس بلب کا نقصان سمجھوں کو بل جل کر برداشت کرنا چاہئے۔
 لیکن جس شخص نے اپنی دیوار پر بلب لگایا تھا وہ اس تجویز کو گول کر گیا، شاید وہ اس خیر کا
 سارا ثواب اپنے حصے میں لینا چاہتا تھا۔

پھر بھی اس نے دو ایک دن بلب نہیں لگایا۔ پروس کے ایک صاحب اپنے یہاں سے بلب
 لا کر لگانا چاہتے تھے تو اس نے انہیں بھی منع کر دیا۔
 ”رہنے دیجئے بھائی صاحب، جب لوگ اس کی افادیت کو نہیں سمجھتے تو ہمیں اس درد سہی
 کی کیا ضرورت ہے۔“

اس درمیان گلی میں رات کے اوقات میں دو تین چھوٹی موٹی وارداتیں ہو گئیں۔ ایک صاحب
 عکرب نما بھیل میں پھسل گئے۔ دوسرے صاحب کسی مکان کے زینے سے ایسے ٹکرائے کہ ان کی
 ایک پاؤں کی رہرکی چپل کا پٹہ ٹوٹ گیا اور انہیں مجبوراً چپل ہاتھ میں لے کر جانا پڑا۔
 ان چھوٹے چھوٹے حادثوں کے بعد مالک مکان نے دیوار پر ایک نیا بلب خرید کر لگادیا، کیونکہ
 اب اس کے گھر میں کوئی فاضل بلب نہیں تھا۔

بلب کی خریداری کے بعد اس نے گلی والوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی کے سامنے اس بات کا اکتشاف
 کیا کہ اب اس پاؤں کے بلب کی قیمت ۳۲ روپے ہو گئی ہے۔

تب ہی یہ فیصلہ ہوا کہ بلب پر پہرہ بٹھا دیا جائے۔

دو دو تین تین افراد کا گردہ گلی میں رات کے وقت دو دو گھنٹے کی ڈیوٹیاں دینے لگا۔

لیکن جلد ہی لوگ ادب گئے اور یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا۔

”بتاؤ کہ ۳۲ روپے کے بلب کے لئے ساری ساری رات برباد کی جائے، لعنت ہے ہم پر۔“

لیکن پھر ایک صاحب فہم نے بتایا کہ معاملہ بلب کی قیمت کا نہیں اس کی افادیت کا ہے،

وہ ہمیں حادثوں سے بچاتا ہے۔

اور تب ایک آسان صورت بلب کی نگہبانی کی یہ نکالی گئی کہ لوگ گھر بیٹھے دروازوں کے

”یہ ٹائی، گھڑی اور دوسری چیزیں ہم نہیں لیں گے، بس ایک نقدی۔“

Sir, We don't kill the Goose that
lays the Golden Egg —

”یہ ہماری سوشلزم کا بنیادی اصول ہے۔“

”لیکن چاچا یہ - 480/ کا کونسا حساب ہوا۔“

”چپ ہے۔ - 20/ روپے وہ ٹائیسٹ لونڈیا لے اڑی ہوگی، جس کے ہونٹوں کی پٹنک
چاچا نے چرائی ہے۔“

”بات یہ ہے آکاش پاسو کہ مجھے یہ علم نہیں تھا کہ آپ اس شرک پر آکاش سے سوشلزم لانے
کے لئے بھیجے گئے ہیں، ورنہ میں حساب سے روپے لاتا۔“

”Thanks God۔“ آپ کو ہمارے مشن کا اتنا خیال ہے۔“

”در اصل چکر یہ ہے سسر جی کہ سوشلزم میں ہر شہری کو برابر بار بار خوش رکھنا پڑتا ہے اس لئے
اگر روپے حساب سے نہ ہوں تو کام SUFFER کرتا ہے۔“

”اب دیکھئے نا۔ - 100/ روپے ہوٹل والے کے، - 50/ چائے والے کے، - 25/ روپے
سگریٹ والے کے۔ اور یہ جو حرامی ہے، یہ بیسوں بونے والوں میں سوشلزم بانٹتا پھرتا ہے۔ ایک - 25/
ان کے لئے بھی۔ - 100/ روپے ”ساقی“ کے کاؤنٹر پر جائیں گے۔ پھر ان خدائی خواروں کی گولیاں
سوگ کے تحفے۔ اس کے علاوہ یہ کہ ہم لوگ ایک لمبی چوڑی سسرال بھی رکھتے ہیں۔ سخت حرامی ہیں ہمارے
سالے سسر۔ ایک آپ ہیں سسر جی کہ آپ نے ہماری رقم سے صرف 20/ روپے اپنی لانڈیا پر خرچ
کئے۔ اسے کہتے ہیں ایکا انداری۔“

”اچھا تو پھر۔ زندہ باد۔“

”زندہ باد۔“

”اور ہاں ہو سکے تو کل اپنے ہی طرح کے ایک آدمہ سوشلسٹ کو اور بھیجئے نا اور۔“

دراوں اور کھڑکیوں سے اسے دیکھتے رہیں۔

دو چار دنوں بعد جب اڑس پڑوس کے لوگوں سے یہ دریافت کیا گیا کہ وہ راتوں میں گھر بیٹھے بلب کی نگہبانی کرتے ہیں؟ تو وہ محض 'ہاں ہوں' میں مال گئے۔ ادھر بلب والے نے بھی صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ رات کے دو چار گھنٹے دروازے سے لگ کر بیٹھنا کسی بھی حال میں ممکن نہیں۔

وہ سب اپنے اپنے دفتر چلے گئے تھے، اس لئے یہ بات اس سے آگے نہیں بڑھی اور یہ طے ہو گیا کہ وہ شام کو دوبارہ مل کر اس مسئلے پر گفتگو کریں گے۔ لیکن شام تک بلب چوری ہو چکا تھا۔

تمام شہا دتوں سے پتہ چلا کہ یہ چوری دن دھاڑے ہوئی ہے، کیونکہ ایک صاحب نے بتایا کہ وہ جب سویرے فجر کی نماز پڑھنے جا رہے تھے تو انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ بلب جل رہا تھا۔ دوسرے صاحب نے بتایا کہ انہیں اچھی طرح یاد ہے کہ صبح دفتر جانے سے پہلے جب وہ لوگ رات کی کارگزار یوں پر غور و خوض کے لئے کھلی میں یکجا ہوئے تھے تو بلب دیوار پر لٹک رہا تھا۔

عام خیال یہ تھا کہ بلب دوپہر میں چوری ہوا ہوگا۔ گھر والے دفتروں میں رہتے ہیں۔ بچے کھاپی کر سوتے ہوں گے اور گلی سنان ہو گئی ہوگی۔

سبھوں کے چہرے اتر گئے۔ اب اس کا کیا جواب ہے کہ تم اگر رات کو پہرہ دو گے تو ہم دن کو چوری کریں گے۔

'چور کے پاس آپ کی ہر ترکیب کی کاٹ موجود ہے۔ ایک صاحب نے انہما خیال کیا۔ تب ہی بلب والے نے بڑے دل شکن لہجے میں کہا۔

”بھائیو میں اب اس نیک کام سے باز آیا۔“

لیکن شام کو جب ایک پڑوسی نے اپنے گھر سے بلب لا کر لگانا چاہا تو وہ بگڑ گیا۔

”یہ کیا بات ہوئی صاحب، دیواریں اور بلب آپ کا۔ یہ نہیں ہو سکتا، یہ میری تو ہیں ہے۔“ چنانچہ اس نے نہ خود بلب لگایا اور نہ کسی دوسرے کو لگانے دیا۔

اس رات ایک صاحب جو گلی کے جغرافیہ سے خاصی اچھی واقفیت رکھتے تھے جب نالی، چیمبر اور

عقرب نہاجیل سے بچ نکلے تو کورے کے اس ڈھیر پر چڑھ گئے، جو اُدھر تین دنوں سے صفائی کے محکمے کی ہڑتال کے سبب گلی میں لگ گیا تھا۔ ان کے پیر میں چل تھی، جس کی وجہ سے کورے کے ڈھیر پر پڑا ایک شیشے کا ٹکڑا ان کی ایڑی کو ہولہان کر گیا۔ ان کے منہ سے زور کی چیخ نکل گئی۔ پڑوس کے ایک صاحب اپنے گھر سے نکلے اور انہوں نے ان کا زخم دھلا کر مرہم پی کر دیا۔ وہ بچا بے لنگراتے ہوئے اپنے گھر کو چل دئے۔

اس طرح پیر پھسلنے اور نالی میں گرنے کے بھی دو چار چھوٹے چھوٹے واقعات رونما ہوئے۔ بلب والے نے ان وارداتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

لیکن تیسرے دن جب ایک کمزور ساراگیر ایک گھر کے زینے سے ٹکرایا تو اس کا توازن کچھ ایسا بگڑا کہ وہ خود عقرب نہاجیل میں جا گرا۔ چل کہیں اور گئی اور عینک کہیں اور — وہ آدمی چونکہ پورے دن کے ساتھ گراتا تھا اس لئے بڑے زور کا دھماکہ ہوا۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔

شور سن کر سبھی لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ دو ایک کے ہاتھ میں مارچ بھی تھی۔ اس غریب کو جب یہ خبر ملی کہ اس کی عینک کی دونوں تال ٹوٹ چکی ہے تو وہ اپنا غم بھول گیا اور ہائے میری عینک ہائے میری عینک، کہہ کر چلانے لگا۔

لوگوں نے اسے دلاسا دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں دھلائے، اسے پانی پلایا، اور چونکہ عام خیال یہ تھا کہ اسے اب کچھ بھائی نہیں رہے رہا ہوگا، اس لئے ایک صاحب اسے اس کے گھر تک پہنچا آئے۔ لیکن اس واقعہ کے بعد بلب والے نے سبھوں کے سامنے یہ اعلان کیا کہ وہ اگلے روز اپنی دیوار پر ایک نیا بلب لگا دیگا۔

چنانچہ دوسرے دن دفتر سے آتے ہوئے وہ ایک نیا بلب خرید لایا اور اسے اپنی دیوار پر آویزاں کر دیا۔ اب اس نے گلی والوں کو بتایا کہ اس بلب میں ایک لاک سٹم لگے ہے جس سے چور بلب کو توڑ تو سکتا ہے پر اسے نکال نہیں سکتا۔

اسن دآشتی کے دن لوٹ آئے۔

دوسرے دن دفتر جانے سے پہلے کی ملاقات میں ایک پڑوسی نے بتایا کہ رات کسی محلے میں

ایک بد معاش نے ایک شریف راغبیر کو چاقو دکھا کر اس کی گھڑی اور بڑھ چھین لیا۔
 اچانک ان کے اپنے دلوں میں کہیں سے ایک چور گھس آیا۔
 ”کیا یہاں بھی ایسا ہو سکتا ہے؟“

تب ہی ان میں سے کسی نے کہا۔ ”لیکن یہاں تو روشنی ہے۔“
 نیا بلب کچھ زیادہ ہی دلوں جل گیا، شاید یوں کہ چور لاک سٹم کی تکنیک سے واقف نہیں تھا۔
 لیکن جب وہ اسے کھولنے کی ترکیب جان گیا تو صبح کی میر سے لڑتے ہوئے ایک صاحب نے
 دیکھا کہ بلب اپنی جگہ سے نایاب تھا۔ کوئی گھنٹے بھر میں گلی کے ہر شخص کو میلم ہو گیا کہ لاک سٹم والا نیا بلب بھی
 چوری ہو گیا۔

دفر جانے سے پہلے وہ طے، تو ان کے دلوں میں اگ سی لگی تھی۔
 ”بھائی صاحب ڈیڑھ دو روپے میں بیچ دیتا ہو گا۔“
 ”یہ کام تو کسی لنگے ہی کا ہے جو اتنے پیسوں میں سینما کا ایک ٹکٹ خرید لیتا ہو گا۔“
 ”لیکن اب کیا ہو گا۔“

ایک صاحب نے پُرانی تجویز دہرائی۔
 ”بلب کے لئے چندہ اکٹھا کیا جائے۔ صرف بھائی صاحب پر..... اس نے بلب والے کی
 طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔“ سارا بار ڈانا مناسب نہیں۔“
 تب بلب والے نے وہی بات کہی جو وہ پہلے بھی کئی بار کہہ چکا تھا۔
 ”میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ دیوار میری ہے تو بلب بھی میری ہو گا، لیکن دوستو کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اس
 اندھیرے کے شانہ زد کو اُجالے میں لائیں جس نے ہمارا جینا دو بھر کر دیا ہے۔“
 ”بلب کا کیا ہے وہ تو ایک نہ ایک لگا ہی جلنے گا۔“

کاروبار

بچے اُسے دیکھتے ہی پہچان گئے تھے، کیونکہ مکالوں کی چھت پر انہوں نے کبھی کوئی ایسا بندر نہیں دیکھا تھا جس کا قد ساڑھے پانچ فٹ سے کچھ زیادہ ہی ہو، اور جو تیزی سے آدمی کی طرح دونوں پاؤں سے چلتا ہو۔

اس کے علاوہ غور سے دیکھنے پر یہ صاف پتہ چلتا تھا کہ کھال دراصل موم جامہ کیا ہوا کوئی خاک کیڑا ہے، جو کثرت استعمال سے سیاہی مائل ہو گیا ہے۔

بندر کی دُم بھی غیر معمولی طور پر لابی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی خاک کی ٹلکی میں کوئی اسپرنگ لگا دی گئی ہے جو حرکت کرنے پر آپ ہی آپ ہلنے لگتی ہے۔

بچے جو اسکول سے واپس آ رہے تھے، ایک ہجوم کی شکل میں بندر کے پیچھے لگ گئے تھے۔ انہوں نے اسکول نہ جلسے والے بچوں کو بھی اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ شاید بندر نے بچوں کے اسکول سے گھر لوٹنے کے وقت کا دانستہ انتخاب کیا تھا، کہ یہ بچے ہی تو تھے جو شور مچا کر راہگیروں اور دوکانداروں

کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتے تھے۔

وہ ہر دوکان کے پلیٹ فارم پر چڑھ کر 'خون خوں' کرتا، بند بھکیاں دکھاتا، اور پھر دوسری دوکان کا رخ کرتا۔

لوگوں نے اسے دیکھ کر کہا۔ "اسے تو اس بات کا بھی علم نہیں کہ بندر چوپایہ ہوتا ہے۔"

دوسرے دن بچوں کے ہجوم میں ایک مالین نظر آئی، جس نے گلابی رنگ کی ساری باندھ رکھی تھی۔ یہ ساری جگہ جگہ سے مسکی ہوئی تھی اور کہیں کہیں سے اس کا رنگ بھی اُڑ گیا تھا۔ مالین نے اپنے جوڑے میں گلاب کا پھول ٹانگ رکھا تھا، اور اس کی ڈوچی میں کسی جنگلی پھول کے دو چار ہارے تھے۔ "لے لو، لے لو ملینیا کا ہار"۔ گاتی ہوئی مالین دوکان دوکان جاتی، اور کچھ چلتے ہوئے گھسے پٹے فقرے۔

"کہاں کہاں پھول بجا رکھے ہیں۔"

"ہار کی قیمت کیا ہے۔" سن کر اور ان کا ترکی بہ ترکی جواب دے کر آگے بڑھ جاتی۔
بچے اپنے خیال میں انکشاف کر رہے تھے "دی ہے، دی ہے۔"

شکاری بھی بچوں ہی کے جلو میں نظر آیا۔ یہ کوئی جنگلی شکاری تھا، جس نے چہرے اور جسم پر ضرورت سے زیادہ سیاہی تھوپ رکھی تھی، سر پر ایک رد مال باندھ رکھا تھا، اور کانوں میں بالے ٹکالے تھے۔

اس کی آنکھوں میں جھک تھی۔ پخلا ہونٹ اس نے کسی ترکیب سے ٹکالیا تھا۔ جسم پر مدری در اس کے نیچے دھوئی باندھ رکھی تھی۔

تیرکمان سنبھالے وہ ہر دوکان پر جاتا اور متجسسانہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھتا۔
آپ نے میرے شکار کو تو نہیں دیکھا، بس اسی طرف بھاگا ہے۔
تھا تو جنگلی مگر بولی خیر والوں کی بولتا تھا۔

گریباں چاک، سرگردیں اُٹا، چہرے پر ہوائیاں اُڑتی ہوئی، برسبہ پیا، زنجیروں میں جکڑا ہوا، فرط غم سے سینا پٹینا ہوا، وہ ہر دوکان پر رک کر پوچھتا — ”بھائیو میری سیلی کہاں ہے؟“ — اور پھر ایک نلک شکان نعرہ لگاتا — ”ہائے سیلی!“ — اس کے پیچھے بچے گاتے جا رہے تھے — ”کوئی پتھر سے نہ مارو مے دیوانے کو!“ —

تب ایک دن لکڑی کی ٹانگیں لگا کر ایک بانس جیسا شخص بازار میں نکل آیا۔ وہ ایک لانبے کرتے میں ملبوس تھا، اور اس کے سر پر سفید جٹا اس طرح رکھی تھی کہ کنارے کنارے اس کے سیاہ بال صاف جھلک رہے تھے۔

اس سے کچھ دنوں پہلے بھی لوگوں نے ایک سکرٹ کمپنی کی اشتہاری ہم میں ایک طویل للقامت آدمی کو دیکھا تھا، جو سفید وردی زیب تن کئے تھا، اور جس نے ایک خوبصورت سی پی کیپ لگا رکھی تھی۔ وہ شخص ہر موڑ پر رک کر اس سکرٹ کی خوبیاں بیان کرتا تھا، مگر یہ شخص تو ہر دوکان پر رک کر کہتا — ”میں ہالیوڈ پر رہتا ہوں، ذرا شہر دیکھئے آگیا ہوں۔“

اس دن ایک شخص بانس میں ننگی تلواریں لے کر بازار میں نکل آیا۔ وہ وحشیانہ انداز میں زور زور سے چلا رہا تھا — ”میں تجھے قتل کر دوں گا، بزدل تو نے میری معشوقہ کو مجھ سے چھین لیا۔“ اس کے چہرے پر خشمونت تھی اور آنکھوں میں غم و غصے کی لہریں تھیں — ”میلے کھیلے کپڑوں میں ایک شکستہ حال شخص —“ کچھ لوگ کہتے جا رہے تھے — ”تلوار لکڑی کی ہے۔“

گہرے رنگ کا لانا کرتا پہنے، گلے میں ایک بڑی سی مالا ڈالے، بڑی بڑی جٹا رکھے اور ہاتھ میں ایک کھنڈل لے کر ایک سادہ ہر دوکان پر جاتا اور کہتا — ”بچہ یہ مایا جال ہے۔ اس سنار سے ناٹھ توڑ، ایشور سے ناٹھ جوڑ۔“ اور یہ کہہ کر

آگے بڑھ جاتا۔

بچوں نے جب دیکھا کہ کہیں سے کچھ نہیں لیتا تو انہوں نے شور مچایا۔ ”ہم پہچان گئے، ہم پہچان گئے۔“

ایک شکن آلودہ انگرکھے، تنگ مہری کے پانچامے اور ایک طرف جھکی ہوئی دوپٹی ٹوپی سر پر لگائے ایک صاحب اس وضع سے بازار میں نکلے کہ حقہ خدمتگار کے ہاتھ میں تھا اور فتح پیچ کی نے ان کے ہاتھ میں۔ ایک کش لیتے ہیں اور ہر دوکان پر رگ کر کہتے ہیں۔
 ”آداب عرض کرتا ہوں قبلہ۔ حقہ حاضر ہے نوش فرمائیے۔“
 بچے شور مچا رہے تھے۔ ”اصلی نواب ہے، اصلی نواب۔“

سیاہ سوٹ لگتا تھا کسی گھڑے سے نکالا گیا ہے۔ ایک سُرخ رنگ کی مڑی تڑی ٹائی گلے میں ڈالے، سر پر جانے کس زمانے کی ایک اونچی سی فیلٹ ہیٹ لگائے اور منہ میں پائپ دبائے، خاصے گہرے سانولے رنگ کا ایک انگریز سٹرک پر دکھائی دیا۔
 ”آئی ایم فرام انگلینڈ۔“
 یہاں پہنچ کر اس کی انگریزی دالی کو بریک سالک جاتا اور وہ آگے بڑھ جاتا۔
 بچے اس کی نقل اُتار رہے تھے۔

دہی دالی نے سُرخ اور سبز چندری باندھ رکھی تھی۔ ایک لانا سا گھونگھٹ کاڑھے، سر پر گھڑا رکھے، ہر دوکان پر رگ کر پوچھتی۔
 ”دور کی نگریا سے آئی ہوں، دہی بیچتی ہوں۔ لوگے؟“
 کسی نے پوچھا۔ ”دودھ نہیں بیچتی ہو؟“

علی بابا ایک گدھے پر سوار تھا۔ اس نے ایک بھٹی پرانی قبا پہن رکھی تھی۔ سر پر ایک بڑی سی پگڑی تھی۔ گدھے کے دونوں طرف بڑی بڑی بھولیاں لٹک رہی تھیں۔
ہر دوکان پر رُک کر کہتا۔ ”کھل جا رسم رسم۔“
اس کے پیچھے بچے کہتے جاتے۔ ”بند ہو جا رسم رسم۔“

انکے دن بازار میں ایک مارواڑی سیٹھ نظر آیا۔ اس نے بند گلے کا سفید کوٹ پہن رکھا تھا اور سفید دھوتی کے نیچے چمکتا ہوا سیاہ نیوٹ جوتا تھا۔ اس نے سر پر زرد رنگ کی مارواڑی وضع کی پگڑی باندھ رکھی تھی۔
ایک کرانا کی دوکان پر رُک کر اس نے کہا۔
سیٹھ جی میں نے آپ کو پچھلے سال پچاس پیٹی مال دیا تھا۔“ اس نے اپنا پیلا کھاتہ کھول کر دکھایا۔

”اس سال اب تک سو پیٹیاں دے چکا ہوں۔“
”کل رقم پچاس ہزار کی بنی۔ آپ نے تقاضوں کے بعد بھی ایک پیسہ نہیں دیا۔ زیادہ دیر کریں گے تو قرقی لے آؤں گا۔“
سیٹھ نے اسے غور سے دیکھ کر ہنس دیا۔
اور تب اُس نے نیکیش بکس سے دو روپے نکال کر کہا۔
”لو یہ رہے تمہارے پچاس ہزار روپے۔“
اس پر مارواڑی سیٹھ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”سیٹھ جی آپ کے اس شہر میں اب تک بارہ کھیل دکھا چکا ہوں۔ سر پر بال بچے ہیں، اوپر سے گرانی۔ آپ ہی لوگوں کا تو سہارا ہے۔ زرا سوچئے کہ ان دو روپیوں میں میرا کیا بنے گا۔“

حالات

یہاں اس ہال میں مختلف علاقوں کے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ شام سے پہلے کچھ لوگوں نے یہاں ایک بڑی دری لاکر بچھا دی تھی، جو گرد سے اٹی ہوئی تھی اور جسے اگر ذرا بھی پھیرا جاتا تو گرد کا ایسا طوفان اٹھتا کہ شکلیں پہچانی نہیں جاتیں، سو دری بچھانے والوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اسے جھاڑے بغیر بچھا دیا جائے۔ دری جب پورے فرش کو اپنے احاطے میں نہیں لے سکی تو کمپیں سے ترپال اور چھوٹی دریاں بھی لاکر بچھا دی گئیں۔

رات آئی تو شرک کی طرف کی بھی کھڑکیاں بند کر دی گئیں۔ موسم گرم ہے، اس لئے شرک کی جانب کی کھڑکیاں بند کر دینے سے چلکے گرم گرم بھاپ پھینک رہے ہیں۔

میری طرح ہر شخص اس بڑے فرش پر حسبِ مقدور بستر بچھا کر لیتا ہے، اس لئے ایسا لگتا ہے کہ ایک بڑے دریا میں بہت سارے بھرے الگ الگ تیر رہے ہیں۔

ہال میں بلب ہیں، مرکزی ٹیوب ہیں، لیکن انہیں روشن کرنا خلافِ مصلحت ہے، کیونکہ باہر شرک پر مہمیت کا تسلط ہے۔ ہاں ہال کے باہر ایک بڑی چھت سے متصل دو تین باغ و مہم ہیں،

جن میں ہلکے پادروں کے بلب جل رہے ہیں، جن کے سبب ہال میں بھی ہلکی ہلکی روشنی آرہی ہے۔ ایسی روشنی جس میں لوگ خود کو دیکھ سکتے ہیں، اور بہت ہی قریب لیٹنے والوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ دفن خانے پر بیٹھے ہیں، انہیں ان کے مومن سے خدخال ہی نظر آتے ہیں اور بس۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ ان ہلکے پادروں کے بلب کی روشنی میں آس پاس کے لوگ نظر آ جاتے ہیں، ورنہ مجھ جیسے لوگ جو ہر گھڑی دو گھڑی بعد کبھی باقہ روم جانے کے لئے اُٹھتے ہیں اور کبھی پانی پینے کے لئے، بستر دس سے گزرتے ہوئے ضرور کسی نہ کسی پر گر پڑتے، کسی نہ کسی کو کچل دیتے اور نتیجے میں چیخ پکار اور مہنگا مہنگا کھڑا ہوتا، جس کے لئے یہ رات اپنے ہونٹوں پر شہادت کی انگلی رکھ کر سختی سے منہ کر رہی ہے۔

دن کے وقت ان اطراف میں نعرے اور آہ و بکا سنائی دی تھی، اور آسمان کی طرف آگ کا بتے تابانہ بھاگتا ہوا لشکر دکھائی دیا تھا۔ اب یہ رات خاموش ہے، لیکن جس طرح چیختا ہوا دن بھیانک تھا، اسی طرح خاموشی میں ڈوبی ہوئی یہ رات بھی بھیانک ہے۔

باہر سڑک پر بھاری بھر کم گاڑیاں محو خرام ہیں۔ ان کی سست رفتاری سے صورت حال اور بھی ہولناک ہو جاتی ہے۔

ہم یہاں اس ہال میں ہیں کہ جس میں سڑک کی جانب کی ساری کھڑکیاں بند ہیں، لیکن ہم خلاؤں میں گھومتے ہوئے وہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں جو سڑک پر ہو رہا ہے۔ ابھی ایک گاڑی رُکی، پھر کیے بعد دیگرے کئی ایک گاڑیاں رُکیں۔ گاڑیوں سے خاکی دریاں سر نکال کر باہر کی طرف دھیمی میں اور پھر بھاری بولوں سمیت سڑک پر کود جاتی ہیں۔ ایک ساتھ بہت سے بوٹوں کی دھمک

— السخوں کا شور —

یہ اسلحے خود خود شور مچاتے ہیں، لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ دوسرے ہر قسم کے شور کو فنا کے گھاٹ اتارنے کا کام بھی ان ہی سے لیا جاتا ہے۔ یہ سب بہت پُرانا چکر ہے۔

مسئلہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ ہم سب اس گھڑی یہاں ہیں مگر دراصل ہم یہاں نہیں ہیں۔ ہم گزرے ہوئے دن کے درمیان کھڑے، آنے والے دن کے متعلق سوچ رہے ہیں۔